بلوچی ادب کی تاریخ

(1947 تا حال)

پناہ بلوچ

اکادمی ادبیات پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

بلوچی ادب کی تاریخ

(1947 تا حال)

پناہ بلوچ

بلوچی ادب کی تاریخ

(1947تاحال)

پناہ بلوچ

اکادمی ادبیات پاکستان
پطرس بخاری روڈ، سیکٹر H-8/1، اسلام آباد

نگران اعلیٰ	:	ڈاکٹر یوسف خشک، میریٹوریس پروفیسر
مدیر اعلیٰ	:	محمد عاصم بٹ
مصنف	:	پناہ بلوچ
نظرثانی	:	حمید قیصر
طباعت	:	اختر رضا سلیمی
اشاعت	:	2022
تعداد	:	500
ناشر	:	اکادمی ادبیات، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	:	نسٹ پریس، اسلام آباد
قیمت	:	مجلد: 200 روپے
		غیر مجلد: 160 روپے

ISBN: 978-969-472-527-7

Balochi Adab Ki Tareekh (1947 to Present)

Written by

Panah Baloch

Publisher

Pakistan Academy of Letters,

Islamabad, Pakistan

فہرست

نثر

پیش نامہ

اکادمی ادبیات پاکستان نے پاکستان کے ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر پاکستانی زبانوں کے 75 سالہ ادبی سفر کے بارے میں اشاعتی سلسلے "پاکستانی زبانوں کی ادبی تاریخ" کا بنیادی مقصد پاکستانی زبانوں میں اس دوران ہونے والی پیش رفت کو ملک اور دنیا کے سامنے روشناس کراتا ہے۔ اس کاوش کے ذریعے ہم محققین، ناقدین اور طالب علموں کو پاکستانی زبانوں کے متعلق بنیادی نوعیت کا تحقیقی مواد فراہم کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس سلسلے کی تمام کتابوں کی نوعیت تحقیقی ہے۔

بلوچی پاکستان کی اہم زبانوں میں سے ایک ہے اور اس میں فصیح و بلیغ تخلیقی ادب کی تاریخ دستیاب ہے۔ بلوچی زبان نے اپنے دامن میں متعدد جدید اصناف کو سمو کر دیگر زبانوں کے ہم پلہ ہونے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں بلوچی ادب کی 75 سالہ پیش رفت کو قارئین کے سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ لوک ادب، شاعری اور نثری ادب کی موجودہ اصناف پر تحقیق کے ذریعے ابتدائی معلومات فراہم کی گئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف پناہ بلوچ متعدد کتابوں کے مصنف اور ادبی حلقوں میں ایک جانے پہچانے محقق اور تخلیق کار ہیں۔ بلوچی ادب و ثقافت اور بلوچ تاریخ پر ان کی گہری نظر ہے۔ اس کتاب پر انہوں نے انتہائی محنت، عرق ریزی اور دل جمعی کے ساتھ کام کیا ہے۔ جس کے لئے ہم ان کے شکر گذار ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ کتاب تحقیق کے حوالے سے قارئین کے استفادے کا باعث بنے گی۔

اس کتاب کے تدوین، تزئین و آرائش اور طباعت کے لئے میں اپنے رفیق کار محمد عاصم بٹ کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو اس اشاعتی منصوبے کے نگران بھی ہیں۔ یہ کتاب پاکستان کی ایک اہم

زبان میں ہونے والی 75 سالہ کاوشوں کا اعتراف ہے۔ امید ہے کہ آپ کو حسب سابق ہماری یہ کاوش بھی پسند آئے گی۔ ہمیں اپنے قارئین کی تجاویز و آرا کا انتظار رہے گا۔

ڈاکٹر یوسف خشک، میریٹوریس پروفیسر

چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان

پیش لفظ

بلوچی ادب کے دستیاب خزانے پر تحقیق کے بعد محققین اسے میر چاکر رند کے دور یعنی پندرہویں و سولہویں صدی کے شہ پارے قرار دے کر اس بات پر بھی بضد ہیں کہ بلوچی شاعری میں زبان کی فصاحت و بلاغت اور سلاست و روانی کو جانچنے اور پرکھنے کے بعد کیسے تسلیم کیا جاسکتا کہ ایک فصیح و بلیغ زبان، دور و زماں کی کسوٹی سے گزرے بغیر اچانک یوں رواں ہوئی ہے۔ بلوچ جس خطے میں آباد رہے ہیں، وہ خطہ زمانہ قدیم سے جغرافیائی اعتبار سے انتہائی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ دنیا اور ارد گرد کی طاقتور قوتوں کے مفادات کا محور رہا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اپنے معاشی، ثقافتی اور موسمی تغیرات، رہن سہن اور حملہ آوروں کی غاصبانہ حکمت عملی کی وجہ سے بکھراو کا شکار رہا ہو۔ نیز اپنے حریت پسندانہ جبلت کے باعث در پیش صورت حال میں اپنی زبان اور اس کی تہذیب و ترویج کی جانب راغب نہ ہو سکے اور نہ ہی اپنے شعری ادب کو تحریری شکل میں محفوظ کر سکے۔

گیارہ ہزار سال قبل مہر گڑھ سے تہذیبی سفر کا باقاعدہ آغاز، زراعت و زرعی زندگی اور مویشیوں کو سدھا کر پالتو بنانے، اپنی سہولت کے لئے زرعی و دیگر اوزار اور حسن کی آرائش و دلکشی کے لئے زیورات بنانے کے محرک، ہزار ہا سال قبل بارشوں کی بہتات سے ندی نالوں میں خوفناک سیلابی ریلوں کی طغیانی سے محفوظ زندگی کے لئے پہاڑ کی چوٹی پر غاروں پر مبنی "شہر روغان" آباد کرنے اور پھر موسمی تبدیلیوں کا شکار ہو کر خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرنے والے بلوچوں کا ادب بھی صدیوں کے سفر کے بعد خطے کی دیگر زبانوں کے ادب کی طرح گزشتہ صدی میں بھرپور سفر کا آغاز کرتا ہے۔

بیسویں صدی میں انمول کلاسیکل شاعری اور دلکش لوک ادب کو ضبط تحریر میں لانے کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ نثر نگاری کے میدان میں افسانہ نگاری، ناول نگاری، ڈرامہ نگاری، ترجمہ

نگاری، انشائیہ نویسی، تنقید نگاری، بچوں کے ادب، خواتین کے ادب، اقبالیات وغیرہ میں طبع آزمائی کرنے کے ساتھ ساتھ شاعری کے میدان میں مزاحمتی شاعری، نظم نگاری، مذہبی شاعری، صوفی شاعری، غزل گوئی، رباعی، دوبیت، قطعہ، ہائیکو وغیرہ جیسے اصناف میں طبع آزمائی کے ذریعے بہت سے نئے اصناف بلوچی ادب کا حصہ بن جاتی ہیں۔

بلوچی زبان کے فروغ میں سب سے اہم کردار بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کا رہا ہے۔ اس کے علاوہ بلوچستان اکیڈمی تربت، سید ہاشمی اکیڈمی گوادر، سید ہاشمی ریفرنس کتاب جاہ کراچی، استین شنگکار کیچ، گمدار شنگکار کیچ، آشار پبلی کیشنز، انسٹیٹیوٹ آف بلوچی، عزت اکیڈمی پنجگور، وفا لبزانکی مجلس تمپ، ملا فاضل ادبی کاروان مند، دیمی چاپ و شنگ کراچی، ناگمان علمی اکیڈمی پلیری گوادر، بہار گاہ چاپ و شنگ حب، ملا فاضل اکیڈمی کراچی، آزات جمالدینی اکیڈمی کراچی، درد پبلی کیشنز گوادر، گوام پبلی کیشنز گوادر، راسکوہ ادبی دیوان نوشکی سمیت دو درجن کے قریب چھوٹے بڑے ادبی اور اشاعتی اداروں کی جانب سے قیام پاکستان سے اس وقت تک لگ بھگ پندرہ سو سے زائد کتب شائع ہو چکی ہیں۔

میں اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین ڈاکٹر یوسف خشک کا انتہائی شکر گذار ہوں کہ جن کی کاوشوں کے باعث بلوچی ادب کے 75 سالہ سفر پر مبنی یہ کتاب شائع ہو رہی ہے۔ اس منصوبے کے نگران اور معروف ناول نگار، افسانہ نگار، نقاد اور مترجم محمد عاصم بٹ کا بھی مشکور ہوں کہ جن کے رابطے اور کاوشوں کے باعث یہ کتاب اشاعت کے مراحل طے کرکے آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

پناہ بلوچ

بلوچی زبان

بلوچی انڈو ایرانین زبانوں کی لڑی میں پروئی ایک قدیم زبان ہے۔ بلوچی زبان کے ماخذ اور اس کی تاریخ کے بارے میں محققین و مورخین مختلف اور متضاد نظریات و خیالات کا اظہار کرتے چلے آرہے ہیں۔ ہیروڈوٹس نے بلوچی زبان کو مکوئی (Mykoi) اور مکرانی لہجے کو میکن (Mykans) لکھا۔ یہاں بلوچی سے مراد مشرقی بلوچی اور مکرانی سے مراد مغربی بلوچی ہے۔ یعنی قدیم دور میں بھی بلوچی زبان کا اپنا الگ وجود رکھتا تھا۔ عرب سیاحوں کے بیانات تاریخ کا حصہ ہیں کہ وہ مکرانی (بلوچی) کو فارسی سے الگ زبان سمجھتے تھے۔ اصطخری لکھتا ہے "مکران والوں کی زبان فارسی اور مکرانی ہے۔ فارسی تاجر لوگ بولتے ہوں گے۔ جن کے ایران کے ساتھ تجارتی تعلقات تھے۔ شریف الادریسی (1099۔1164) نے بھی لکھا ہے کہ مکران کی زبان فارسی اور مکرانی ہے۔ ابن حوقل کا بھی یہی بیان ہے۔ اس بیان کی تصدیق مارکوپولو بھی کرتا ہے۔ سیاح مارکوپولو چین جاتے ہوئے یہاں سے گزرا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ مکران میں ایک خاص قسم کی زبان بولی جاتی ہے۔ چنانچہ بلوچ ماہرین علم و تحقیق کا خیال ہے "بلوچی قدیم زبانوں میں سے ایک ہے۔ کئی کتبے بلوچی زبان میں لکھے ہوئے ہیں"(1)۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مطابق بعض مصنفین کے نزدیک بلوچی فارسی کی مسخ شدہ صورت ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ بلوچی فارسی سے زیادہ قدیم ہے۔ مرغ سریاب، نزد کوئٹہ سے چند ایسے کتبے دستیاب ہوئے ہیں جن کا رسم الخط فارسی کے بجائے روسی سے ملتا جلتا ہے۔ ان میں بلوچی زبان کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ بلوچی ایک آزاد و قائم بالذات زبان ہے اور موجودہ فارسی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ صوتی اعتبار سے بلوچی قدیم پہلوی کے بہت قریب ہے۔ لسانیات کے ماہرین کا خیال ہے بلوچی قدیم باختریہ کی زبان ژند سے بہت مماثلت رکھتی ہے(2)۔

بلوچی قدیم آریائی زبانوں کی ایرانی شاخ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا سرچشمہ اور زبانی علوم کے مطابق تعلق ایران کی قدیم زبانوں جیسا کہ میدی، قدیم فارسی، اوستا، پہلوی، پارتھی کے ساتھ کسی نہ کسی طرح جڑتا ہے۔ لیکن گمان وقیاس یہ ہے کہ بلوچی زبان کا سرچشمہ ایک گمشدہ اور مردہ ایرانی زبان ہو سکتا ہے۔ وہ "میدی" زبان ہے جو بلوچی زبان کی ماں ہو سکتی ہے(3)۔ اگر علمی نقطہ نگاہ سے زبان پر تحقیق کی جائے تو ہم یہ حقیقت ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ بلوچی زبان قدیم آریائی زبان کی ایک شاخ کی حیثیت سے ابھر کر اور مراحل طے کر کے آج موجودہ شکل میں ہم تک پہنچی ہے(4)۔ مورخین اور ماہر لسانیات اس بات پر متفق ہیں کہ بلوچی دو ہزار پانچ سو سال سے چار ہزار سال قدیم زبان ہے اور ہند یورپی زبانوں کے ایرانی شاخ سے تعلق رکھتی ہے۔ بلوچی زبان ایران کے شمال مشرق کی زبان تھی اور آج کل ایران کی جنوب مشرقی علاقوں میں بولی جاتی ہے(5)۔

بلوچوں کی اکثریت کو آریا قرار دینے کا ایک بہت بڑا سہارا خود ہماری زبان بلوچی ہے۔ زبان دانوں نے لسانی رشتوں کے حوالے سے قرار دیا ہے کہ بلوچی ایک قدیم آریائی زبان ہے۔ جو اوستا سے قربت رکھنے کے علاوہ اوستا کے بہت سے الفاظ استعمال کرتی ہے۔ جس طرح اس کا رشتہ فارسی اور پہلوی سے موجود ہے۔ اسی طرح ماژندرانی، گیلکی اور دیگر زبانوں سے بھی اس کا لین دین موجود ہے۔ بلوچی گرامر ساخت کے لحاظ سے پشتو کے ساتھ بہت قربت رکھتی ہے۔ دونوں زبانوں میں ایک دوسرے کے بہت الفاظ موجود ہیں۔ علاوہ ازیں بلوچی میں سنسکرت کے بہت سارے الفاظ موجود ہیں(6)۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مختلف ادوار میں فارسی میں وقوع پذیر ہونے والی چند اختراعی اثرات بلوچی اور کردی زبانوں پر مرتب ہوتے رہے ہیں۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بلوچی اور کردی قدیم ایرانی عہد سے فارسی سے اثر پذیر رہی ہیں اور کچھ ارتقائی تغیرات جو پارتھی زبان میں وقوع پذیر ہوتے رہے ہیں۔ اس قسم کے محدود اثرات غالباً بلوچی میں بھی در آئے ہیں لیکن کردی میں اس قسم کے اثرات نظر نہیں آتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کردی کے بجائے بلوچی درمیانی ایرانی عہد میں ایک شمال مغربی ایرانی زبان رہی ہے(7)۔

جدید تحقیق کے بعد لسانیات کے ماہرین اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ میدین زبان(Median or Medic) میدوں کی زبان تھی۔ یہ ایک قدیم ایرانی زبان ہے۔ یہ

شمال مغربی ایرانی زبانوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ آذری(Azari)، زازکی (Zazaki)، لکی(Laki)، گورانی (Gorani)، گیلکی (Gilaki)، مازندرانی (Mazandrani)، کرمانجی (Karamanji)، سورانی (Sorani) اور بلوچی (Balochi) بھی شمال مغربی ایرانی زبانوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

زبان کے ماہرین بلوچی زبان کے سومیری، سامی، عربی، عیلامی اور اکادی زبانوں کے ساتھ روابط کا ذکر کرتے ہیں۔ اب تاریخ واضح کرتی ہے کہ مید بلوچ تھے تو ان کی زبان بھی بلوچی ہوگی اور موجودہ بلوچی میدین زبان کی تسلسل ہی ہوگی۔ ہخامنشی بادشاہوں کے دربار میں بھی بلوچی زبان بولی جاتی تھی(8)۔ بلوچی زبان میں باقاعدہ طور پر تحریر اور ادبی تحریک کا آغاز بیسویں صدی پچاس کی دہائی میں ہوتا ہے(9)۔ اگر ہم بلوچی کے لکھنے کی تاریخ کو دیکھتے ہیں تو بلوچی زبان کو دونوں یعنی رومن اور عربی رسم الخط میں آج سے دو سو سال قبل سے لکھا جا رہا ہے(10)۔

بلوچی زبان کی سماجی تاریخ اور رشتے کے بارے میں نامور تاریخ دان و محقق ڈاکٹر شاہ محمد مری لکھتے ہیں۔ "ان تمام رشتوں کے ساتھ ساتھ بلوچوں کا ثقافتی اور معاشرتی رشتہ مہر گڑھ کے ساتھ بھی ہے۔ ہم پانچ سو سال کے بجائے گیارہ ہزار سال پرانے لوگ ہیں۔ مبالغہ آمیز تکبر نہ کیا جائے تو سارے وسطی اور ایشیا کے انسانوں، ان کی تہذیبوں اور زبان کا منبع ہم ہیں۔ یعنی مہر گڑھ کا انسان بولتا تھا۔

یعنی انسان بولتا تھا---------------گیارہ ہزار سال قبل
ہم بھی بولتے تھے---------------گیارہ ہزار سال قبل
ہماری مادری زبانوں کی تشکیل ہوئی-----گیارہ ہزار سال قبل

گیارہ ہزار سال قبل بلوچ، زبان سے مخصوص آوازیں نکالتے نکالتے اور انہیں لفظ کی شکل دے کر جانوروں سے خود کو الگ اور ممتاز کر چکا تھا۔ مہر گڑھ کے باقیات کی آج بھی بلوچ ثقافت اور معاشرتی زندگی میں واضح عکس نے انہیں دنیا کی قدیم ترین تہذیب کے ساتھ رشتہ جوڑ دیا ہے۔ لیکن وہاں کے باقیات میں سے زبان یا تحریر کو آج تک ماہر لسانیات کے فن جراحی کے ذریعے ڈی کوڈ نہیں کیا جا سکا۔ جب یہ مرحلہ آئے گا تو مندرجہ بالا بحث کو نئی شکل ملے گی اور بلوچی زبان کو نئی پہچان"(11)۔

زبان عام طور پر صوتیاتی، تشکیلاتی اور حضیاتی فرق و اختلاف کے باعث کئی لہجوں کی حامل بن جاتی ہے۔ ایک زبان کے مختلف لہجوں میں فرق و اختلاف کی وجوہات جغرافیائی، سماجی، معاشی اور معاشرتی صورت حال اور ہمسایہ زبانوں کے اثرات کے علاوہ دوسرے عوامل بھی اپنا کردار ادا کرتے ہیں (12)۔ جس زبان کے مختلف لہجے نہ ہوں یا لہجے کم تعداد میں ہوں، وہ زبان نہ تو عظیم کہلائے گی اور نہ ہی دیر تک زندہ رہ سکے گی۔ فطرت وان یونٹ کے خلاف ہے۔ بلوچ (بلوچی زبان بولنے والے اور بلوچی نہ بولنے والے دونوں) دنیا کے مختلف حصوں میں بکھرے ہوئے ہیں (13)۔ اسی زبان کے لہجوں کے بارے میں پہلا ذکر ہمیں ہیروڈوٹس بتاتے ہوئے وہ دو لہجوں کا ذکر کرتا ہے۔ پھر مارسٹن نے بھی ذکر کیا ہے۔ لانگ ورتھ ڈیمز، ولیم گائیگر، گیئرسن، مورگن سٹرائن، جوزف ایلفن بیین وغیرہ بھی اسے دو بڑے لہجے میں تقسیم کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے کچھ ماہرین مشرقی اور مغربی لہجوں کے بجائے تین لہجوں مشرقی (سلیمانی)، مغربی (مکرانی) اور شمالی (رخشانی) کی بات کرتے ہیں۔ لیکن ماہرین لسانیات کی اکثریت دو لہجوں پر اتفاق کرتی ہے اور ان دو یعنی مشرقی اور مغربی لہجوں میں مزید ذیلی لہجوں کا ذکر کرتے ہیں۔

گیئرسن نے اس سلسلے میں ڈیمز کا ایک بیان بطور حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ " دونوں لہجوں (مشرقی اور مغربی) میں بڑا واضح فرق موجود ہے لیکن موازنہ کرنا چاہیں تو دونوں میں ایک قسم کا ربط نظر آئے گا۔ "مشرقی بلوچی میں سندھی اور لہندا کے الفاظ شامل ہیں اور مغربی میں فارسی کے الفاظ کی موجودگی نظر آتی ہے"۔ (14)۔

بلوچی زبان کے لہجوں کے فرق و اختلاف کے بارے میں جوزف ایلفن بیین نے اپنی تحقیقی کتاب (Balochi Language: A Dailectology with Text) میں تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ ان کے مطابق مجموعی طور پر بلوچی زبان کے چھ بڑے نمایاں لہجے ہیں۔ جن میں ایک لہجہ مشرقی ہے (جسے بعض اوقات سلیمانی لہجہ بھی کہا جاتا ہے) جس میں تمام مشرقی لہجے شامل ہیں۔ جبکہ بقیہ پانچ لہجے مغربی بلوچی کے متعلق ہیں۔ وہ مشرقی بلوچی میں کوئٹہ سے لورالائی بشمول ڈیرہ غازی خان اور اس کے جنوب میں مری اور بگٹی علاقے اور اپر سندھ کی سرحد تک کے لہجوں کو شامل کرتے ہیں جبکہ مغربی بلوچی کے پانچ نمایاں لہجوں کو وہ رخشانی، سراوانی، کیچی، لوتوتی یعنی لاشاری اور ساحلی میں تقسیم کرتے ہیں اور اس کے علاوہ رخشانی

لہجہ کو مزید پانچ ذیلی شاخوں کلاتی، چاقی و خارانی، افغانی، سرحدی اور جھگوری میں تقسیم کرتے ہیں۔ نیزان کے خیال کے مطابق سب سے زیادہ مستعمل لہجہ ہے۔ ان کے مطابق ان لہجوں کا لسانی جغرافیہ کچھ اس طرح ہے۔

1۔ کلاتی لہجہ: رخشانی گروہ کا کلاتی لہجہ جنوب میں لسبیلہ سے نال اور مشکے تک مستعمل ہے۔ لیکن درمیان میں قلات کے نزدیک منگچر، نرک اور جوہان وغیرہ میں مستعمل بلوچی جسے رندی لہجہ بھی کہا جا سکتا ہے جو مشرقی پہاڑی لہجے کے قریب تر ہے۔

ب۔ افغانی لہجہ: یہ لہجہ ہلمند کے ساتھ ساتھ قندھار تک جن علاقوں میں مستعمل ہے ان میں گرشک، دروبار، چار برد ک وغیرہ شامل ہیں۔

ج۔ سرحدی لہجہ: سرحدی لہجہ دالبندین ضلع چاغی سے لے کر شمال مغرب ہلمند میں چار برد ک، زابل، سیستان، بم اور مرو میں مستعمل ہے۔ ایلفنسٹن بیئن ترکمانستان میں رہنے والے بلوچوں کی زبان کو بھی سرحدی لہجہ میں شامل کرتے ہیں۔

د۔ جھگوری لہجہ: ناگ سے کلات کے جنوب مغرب تک مغربی جانب رخشان ندی کے ساتھ ایرانی سرحد اور شمال کی جانب ماسون ماشکیل تک اور جنوب کی جانب یہ لہجہ آواران سے ہوشاپ تک بولا جاتا ہے۔

2۔ سراوانی لہجہ: زاہدان سے جنوب میں راسک، کوہک اور خاش کے علاقوں میں بولا جاتا ہے، سراوانی لہجہ فارسی سے بہت متاثر ہے۔ فارسی اور سراوانی لہجے میں ایک تو مصادر بہت مشترک ہیں اور یہ ماضی کے Stem سے بنتے ہیں اور اس کے علاوہ عام بلوچی اضافی حالت کے بجائے اس میں فارسی ہی کی طرح اضافہ (Izafa) کی صورت ملتی ہے۔

3۔ کیچی لہجہ۔ بلوچی کا کیچی لہجہ جو وادی کیچ (مکران) سے مغرب تپ تک مستعمل ہے۔ فی زمانہ بلوچی کا سب سے معیاری اور مستند لہجہ کہلاتا ہے۔

4۔ لاشاری لہجہ: یہ لہجہ خاش سے چاسپ ایران شہر مغرب میں فانوج اور گیلان تک بولا جاتا ہے۔ یہ لہجہ جھگروی سے زیادہ متاثر ہے اور یہ اس کی جگہ لے رہا ہے ایلفن بیئن نے اسے 1966 میں لوٹونی (Lotuni) لہجے کا نام دیا تھا۔

5۔ ساحلی لہجہ: ساحلی لہجہ جسے "رندی لہجہ" بھی کہا جاتا ہے بلوچی زبان کا وہ لہجہ ہے جو

ایران اور پاکستان دونوں ممالک میں بلوچ علاقوں میں مستعمل ہے۔ جوزف ایلفن بیئن کے خیال میں یہ لہجہ ایرانی بلوچستان میں بیابان، مشرق کی جانب چاہ بہار شمال کی طرف نیک شہر، قصر قند وغیرہ اور پاکستانی بلوچستان میں مند اور دشت کے علاقوں سے لے کر تمام ساحلی پٹی جو گوادر، پسنی اور اورماڑہ سے ہوتا ہوا کراچی تک ہے میں مستعمل ہے۔ ایلفن بیئن کے خیال میں ساحلی لہجہ اور مشرقی لہجہ بلوچی زبان کے قدیم اور ابتدائی (Archaic) لہجے ہیں (15)۔

قرنیا جہانی، ایلفن بیئن کی تقسیم سے اتفاق کرتے ہوئے مغربی بلوچی کو دو بڑے لہجوں مکرانی اور رخشانی کا نام دیتی ہیں۔ مکرانی میں وہ ساحلی، کیچی اور لاشاری لہجے کو شامل کرتی ہیں۔ جبکہ رخشانی میں رخشانی اور سراوانی لہجوں کو شامل کرتی ہیں جنہیں ایلفن بیئن نے بالترتیب جنوبی اور مغربی لہجوں کا نام دیا ہے۔ قرنیا جہانی کراچی کے لہجے کو بھی مکرانی لہجے میں شامل کرتی ہیں اور اس کے مطابق مکرانی لہجہ، رخشانی لہجہ کی نسبت بہت سے معاملات میں مشرقی بلوچی سے مطابقت رکھتا ہے (16)۔

بلوچی زبان کے سب لہجے بلوچی زبان و ادب کے فروغ میں اپنی اپنی جگہ پر کردار ادا کر رہے ہیں۔ مختلف ادوار، واقعات، حالات، گردش دوران میں مختلف لہجوں پر اثرات مرتب کئے ہیں۔ تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کبھی ایک لہجہ ادبی کاوشوں میں سرخرو رہا تو کبھی دوسرا لہجہ حاوی رہا۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری لکھتے ہیں "یہ سب بلوچی زبان کی آنکھیں ہیں۔ ہر لہجہ میں کمال کا ادب تخلیق ہوا ہے اور بہت متین ادب تخلیق ہوا۔ لہجوں کے بارے میں جاگیردارانہ تفاخر و تعصب غیر انسانی ہے۔ زبان کرامت رکھتی ہے جس نے زبان کی (یا اس کے کسی لہجے کی) توہین کی، زبان اسے ضرور بد کھلائے گی" (17)۔

بلوچی زبان کی طرح بلوچی ادب بھی اس خطے کے قدیم ترین ادب میں شمار ہوتا ہے۔ جس طرح بلوچی زبان کی قدامت سے انکار ناممکن ہے ٹھیک اسی طرح بلوچی ادب کی قدامت سے انکار کرنا حقیقت سے منہ موڑنے کے مترادف ہوگا۔ کیونکہ بلوچی ایک ایسی غنی زبان ہے جس میں وہ تمام خوبیاں اور صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود ہیں جو ایک ادبی زبان میں ضروری ہیں۔ البتہ یہ بات قابل ضرور ہے کہ چاکر دور سے پہلے کی کوئی بلوچی تحریر ماسوائے سنگ نبشتوں اور آثار قدیمہ کے کتبوں کے ہم تک نہیں پہنچ سکی۔ لیکن یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کیونکہ بلوچ قوم سے ہزاروں گنا طاقتور منظم اور تاریخ ساز اقوام بھی گزری ہیں جو اپنی کسی چیز کو دست برد زمانہ سے

نہ بچا سکیں اور بالآخر خود نیست و نابود ہو گئیں(17)۔ بلوچی زبان کا ادب اپنی گوناگوں خوبیوں کے لحاظ سے جہاں بے حد دلکش اور رومانی ہے۔ وہاں تہذیبی اور ثقافتی خصوصیات کی نمائندگی کرتا ہے(18)۔ بلوچی ادب دوسری قوموں کے ادب سے کسی طرح کم تر نہیں بلکہ بلوچی ادب میں عوام کا حصہ ہے کیونکہ اسے ان حساس لوگوں نے تخلیق کیا ہے جو خود عوام میں سے تھے اور عوامی خیالات و جذبات کی نمائندگی کے اہل تھے۔ انہوں نے فنی باریکیوں کے بجائے سادگی، اسلوب بیان اور وحدت تاثیر جیسی فنی خوبیوں کا خیال رکھا اور بلوچی ادب ان خصوصیات کی صحیح نمائندگی کرتا ہے(19)۔ بلوچی کا اپنا مزاج اور اپنی طبیعت ہے۔ یہ مزاج اپنے آپ کو اصطلاحات سے لے کر الفاظ کی ترتیب تک، زندگی کے دانش سے کائنات کے بے پایاں علم تک، نیکی و بدی سے لے کر خداوند و پیغمبران کے احوال تک، تہذیب و ثقافت سے لے کر روزمرہ معمولات کو عیاں کرتا ہے۔ یہ سب بلوچی زبان اور اس کے اظہار سے وابستہ ہے۔ زبان یہ نہیں کی صرف رہن سہن اور کھانے پینے کے معنی فراہم کرے بلکہ یہ ہے کہ تہذیب و ثقافت کو حقیقی طور پر آشکار کرے اور قوم کی ابدی دانش اور اجتماعی احساسات کی ترجمانی کرے۔ اس میدان میں بلوچی ایران اور ہندوستان کی زبانوں سے کہیں پیچھے نہیں(20)۔

حوالہ جات:

1۔ میمن عبدالمجید سندھی۔ 1971۔ بلوچی ادب، در تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند چودھویں جلد، علاقائی ادب [illegible] مغربی پاکستان جلد دوئم، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ص۔ 362-361۔
2۔ واحد بخش بزدار۔ 2008۔ بلوچی زبان لسانی تاریخ در تکا (تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی) مرکز مطالعہ پاکستان جامعہ بلوچستان کوئٹہ ص۔ 21
3۔ ڈاکٹر غفور شاد۔ 2019۔ بلوچی زبان ءُ نبشتہ رہبند، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ ص۔ 29
4۔ میر شیر محمد مری۔ 2007۔ (اشاعت دوئم) بلوچی زبان و ادب کی تاریخ، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ ص۔ 42
5۔ حامد علی بلوچ۔ 2012۔ آدینک گچین جاک، بلوچستان اکیڈمی تربت۔ ص۔ 80
6۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری۔ 2009۔ مختصر تاریخ زبان و ادب بلوچی، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد۔ ص۔ 7
7۔ واحد بخش بزدار۔ 2008۔ ص۔ 21
8۔ سید ظہور شاہ ہاشمی۔ 1986۔ بلوچی زبان و ادب کے تاریخ کا جائزہ، سید ہاشمی اکیڈمی، کراچی۔ ص۔ 64
9۔ نسرین گل۔ 2017۔ ساتک [illegible]، سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی۔ ص۔ 268
10۔ ڈاکٹر غفور شاد۔ 2019۔ ص۔ 284

11۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری۔ 2009۔ ص۔ 2

12۔ واحد بخش بزدار۔ 2008۔ ص۔ 106

13۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری۔ 2009۔ ص۔ 9

14۔ میمن عبدالمجید سندھی۔ 1971۔ ص۔ 363

15۔ واحد بخش بزدار۔ 2008۔ ص۔ 107-108

16۔ قرینا جہانی۔ 2003۔ دی بلوچ اینڈ دیئر نیبرز ایتھنک اینڈ لنگوئسٹک کونٹیکٹ ان بلوچستان ان ہسٹوریکل اینڈ ماڈرن ٹائمز۔ ص۔ 74-75

17۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری۔ 2009۔ ص۔ 25

18۔ سید ظہور شاہ ہاشمی۔ 1986۔ بلوچی زبان و ادب کے تاریخ کا جائزہ۔ سید ہاشمی اکیڈمی، کراچی۔ ص 64

19۔ عبدالرحمن غور۔ 1968۔ نقد کوہسار۔ بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ۔ ص۔ 17

20۔ شے رگام۔ 2017۔ پشتاں کوتنیں پلوش من سبب انت۔ بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ۔ ص۔ 79

بلوچی ادب

بلوچی ادب کے دستیاب خزانے کا تعلق میر چاکر رند یعنی پندرھویں صدی سے ہوتا ہے۔ لیکن اہل قلم، ادبی محققین واضح لکھتے ہیں کہ یہ دور ابتدا نہیں بلکہ ایک تسلسل کی واضح دلیل دیتا ہے۔ پندرھویں صدی کے منظوم شہ پاروں کو دیکھ کر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ بلوچی زبان میں شعر و سخن کی گرم بازاری قدیم زمانہ میں بھی رہی ہوگی۔ لیکن امتداد زمانہ سے اس کے آثار باقی نہیں رہے (1)۔ مقام حیرت ہے کہ جو بلوچ گوئیے میر چاکر رند اور گواہرام لاشاری کے زمانے کے اشعار پشت در پشت، سینہ بہ سینہ آج تک منتقل کرتے چلے آرہے ہیں۔ میر چاکر کے دور سے ما قبل اشعار کا سلسلہ ان کے آباؤاجداد جاری کیوں نہ رکھ سکے؟! اگر کہا جائے کہ بلوچی شاعری کا آغاز میر چاکر رند کے زمانے میں ہوا، تب بھی اس دور کی بلوچی شاعری میں زبان کی فصاحت و بلاغت اور سلاست اور روانی کو جانچنے اور پرکھنے کے بعد کیسے تسلیم کیا جاسکتا کہ ایک فصیح و بلیغ زبان دور و زماں کی کسوٹی سے گزرے بغیر اچانک یوں رواں ہوئی۔ ہمیں مجبوراً ماننا پڑے گا کہ سیاہوش اور اعظمش وغیرہ بلوچ مشاہیر کے قدیم زمانے سے لے کر میر جلال خان کے زمانے تک بلوچی کے شاعر ضرور گذرے ہوں گے، انہوں نے اشعار بھی کہے ہوں گے لیکن بعض وجوہ کی بناء پر جن کی ہم نشان دہی کرنے سے عاجز ہیں ان شعراء کے اشعار ہم تک نہیں پہنچ سکے (2)۔

ماضی میں بلوچ قبائل زیادہ تر کوہ و بیابان اور بے آب و گیاہ میدانوں میں بھی بود و باش رکھتے رہے تھے، جہاں زرعی معیشت، وسائل نہایت محدود بلکہ تقریباً مفقود تھے۔ اس لئے وہ ریوڑ پالنے، بھیڑ و بکریاں چرانے اور گلہ بانی کرنے پر مجبور تھے۔ چنانچہ وہ صدیوں تک اسی پیشہ سے منسلک رہے اور پانی، چراگاہوں اور سبزہ زاروں کی تلاش میں سرگرداں ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرتے رہے۔ اس کے علاوہ بلوچ قبائل جہاں بھی رہے وہاں جابر سلاطین اور مستبد

حکمرانوں نے بلوچوں کی آزادروی اور حریت پسندانہ جبلت کو شک وشبہ کی نظروں سے دیکھا۔ ان حالات میں بلوچ نہ تو اپنی زبان کی تہذیب و ترقی کی جانب غور کر سکے اور نہ ہی اپنے شعری ادب کو تحریر میں لا سکے۔ زبان کی ترقی اور پیش رفت تو در کنار وہ اپنے ادبی سرمایہ کے تحفظ اور اسے آئندہ نسلوں تک پہنچانے کا بھی سروسامان نہ کر سکے(3)۔ اگرچہ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہخامنشی شاہنشاہوں کی اپنی خاندانی اور درباری زبان بھی بلوچی تھی۔ لیکن ہمارے ہاں ان نبشتوں اور کتبوں کے سوا کوئی اور چیز اثبات کے لئے حاضر نہیں۔ البتہ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ بلوچی ایک زندہ و جاوید زبان ہے۔ جس نے ماقبل سے اس پر ناجائز و عاید شدہ ظلم و تعدی کے مقابلے میں نہایت پائیداری اور پامردی سے قائم رہ کر تمام مشکلات و مصائب کا مقابلہ کر کے اپنی حقیقت اور صلاحیت کو آج تک قائم رکھنے میں کھلی کامیابی حاصل کی ہے۔ اس سے ہمیں انکار نہیں کہ یہ قوم ہمیشہ طوائف الملوکی ادوار میں رہی چونکہ اس قوم میں مرکزیت مفقا تھی۔ اس لئے قبائلی نظام حیات کے تحت جیتی رہی ہے اور اسالیب و حقائق پر اس کی تاریخ مرتب ہوتی رہی(4)۔

قبائلی نظام حیات کی اساس چند رسوم و روایات پر قائم ہے۔ ان روایات میں اخلاص عمل، سخاوت، شجاعت، راست گفتاری، مہمان نوازی، ہمسایہ کے حقوق کی حفاظت، انفرادیت کا تحفظ وغیرہ نمایاں اہمیت رکھتے ہیں اور بلوچی ادب انہی اقدار کے محور پہ گردش کرتا ہے۔ بلوچی ادب نہ صرف قبائلی تاریخ پر روشنی ڈالتا ہے۔ بلکہ قبائلی مزاج اور عوامی ذہن کو سمجھنے میں بھی مدد دیتا ہے۔ اس اعتبار سے بلوچی ادب جس کی جزئیات پر ان سطور میں بحث کی گئی ہے۔ سنجیدہ و معیاری اور بلند پایہ ادب قرار پانے کا مستحق ہے(5)۔ ان گنت حشر سامانیوں کے باوجود ہمارے ہاں دستیاب ادب اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے باوجود اس خطے میں موجود دیگر اقوام کے ادب سے کسی طور پر پیچھے نہیں بلکہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اس میں سخن کی تمام اصناف بے پناہ خوبیوں کے ساتھ موجود ہیں جو کہ ایک زندہ و جاوید قوم کی نشانی ہیں۔ بلوچی زبان و ادب کی تاریخ دراصل ہمارے عوام الناس کے حوصلے بلند کرتی ہے۔ بلوچ عوام بہت شوق سے اپنی زبان و ادب کے ماضی کے بارے میں بولتے اور سنتے ہیں۔ نئی نسل جتنا زیادہ زبان کے ماضی سے شناسا ہو گی اتنا زیادہ اپنے عوام کی نفسیات سے آگاہ رہے گی۔ بلوچ کی تقدیر ہے کہ ہمیشہ ایک بار پیچھے دیکھیں گے۔ اس ماضی کی زمین پر مضبوطی سے پیر جما کر ہم پھر دوبارہ آگے دیکھیں گے اور اس طرح آج کو دریافت کریں گے(6)۔

بارہویں صدی میں جب بلوچوں نے میر جلال بان(1100-1185)کی سربراہی میں مکران میں مرکزیت قائم کرتے ہیں تو وہاں سے قومی،سیاسی اور ادبی سفر کو تقویت ملتی ہے۔ دنیا کی تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ زبان و ادب اس وقت ترقی کے مدارج طے کرتے ہیں جب انہیں اپنے ریاست کی حمایت ملتی ہے۔ بلوچی زبان و ادب نے بھی مکران میں ایک آزاد ماحول میں اپنے سفر کا آغاز کیا۔ یوں اس دور میں کلاسیکل ادب کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ میر چاکر کے دور تک پہنچ کر بلوغت حاصل کرکے توانا شکل اختیار کرتی ہے۔(7)۔

اٹھارہویں صدی جب پہلی بار بلوچی ادب کو تحریری شکل دینے کا آغاز ہوا تو اس کے لئے عربی اور فارسی رسم الخط استعمال کیا جانے لگا۔ بلوچی زبان میں سب سے قدیم مسودہ (Codex Oriental Additional 2404)ہے جسے 1820 میں ہوتان کلتی نے مرتب کیا تھا۔ دوسرے دو مسودات کلاان گچگی نے 1873 میں (Oriental) 2439اور 1877 میں (Oriental2129)تحریر کئے (7)۔ انہی دنوں کئی ایک مستشرقین جن کو عربی زبان یا فارسی زبان اور ان کے رسوم الخط سے آشنائی ہو چکی تھی، نے بلوچی اشعار، قصص و دیگر نوشتہ جات بھی بلوچی رسم الخط میں اکٹھا کر کے ریکارڈ کر لئے تھے۔ جن کا ثبوت جوزف ایلفنسٹن بیٹن کے اس حوالے سے ملتا ہے جو اس نے ایک چھوٹے سے کتابچہ "شاہ بہرام و گلندام" کے پیش لفظ میں لکھا ہے۔ لکھتے ہیں کہ اس قصے کا بلوچی رسم الخط میں لکھا ہوا متن برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ میوزیم نے اس مسودے کو 1861 میں ایک انگریز بیوہ سے خریدا تھا اور یہ معلوم نہ ہو سکا اس بیوہ کو یہ مسودہ کب، کہاں اور کیسے دستیاب ہوا(8)۔

بلوچی شاعری کو قلمبند کرنے کے سلسلے میں مستشرقین نے بھی تحقیقی کام کیا۔ انہوں نے بڑی محنت اور توجہ سے بلوچی اشعار کے مختلف متن اور تلفظ کا تقابلی مطالعہ، محاکمہ اور تبصرہ کیا۔ یہ ایک تحقیقی سرمایہ ہے۔ اس طرح کی بے شمار مواد رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں شائع ہوئیں اور ان پر بحث بھی ہوئی۔ فوک لور سوسائٹی کے رسالہ "فوک لور" میں 1840 میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے جرنل میں شائع کروائے، یہ اشعار بلوچوں کے حسب و نسب کے متعلق ہیں۔ 1877 میں برٹن کی کتاب(Sind) شائع ہوئی۔ اس میں تین بلوچی نظموں کا ترجمہ ہے۔ 1880 میں ایل ڈیمز نے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے جرنل میں (Sketch of the

northern Balochi language) کے عنوان سے کچھ بلوچی اشعار مع ترجمہ شائع کروائے۔ 1891ء میں ایل ڈیمز کی کتاب "بلوچی ٹیکسٹ بک" شائع ہوئی اس میں اشعار تھے۔ کچھ بلوچی اشعار سر رچرڈ ٹمپل کی کتاب (Legends of the Punjab) میں بھی آ گئے ہیں۔ پھر ایم میمٹر نے بھی (Balochi Classics) شائع کی، جس میں انہوں نے کئی بلوچی اشعار مع ترجمے دیئے۔ 1907ء میں لاہور سے اردو میں ہتورام کا بلوچی نامہ شائع ہوا۔ اس میں بھی کچھ بلوچی اشعار تھے۔ اسی سال ڈیمز کی مشہور کتاب (Popular poetry of the Baluchis) رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی طرف سے شائع ہوئی۔ "جنگ نامک" پر گیدو ڈوم نے ایک ہزار ابیات پر مشتمل رزمیہ نظم لکھی تھی۔ میر مراد بخش خان غزنی نے ان میں سے سو شعار اس کے پوتے عطو کی زبان سے قلمبند کر کے مع ترجمہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے جرنل میں شائع کروائے۔ ماہرین کے مطابق ان سب میں سے ایل ڈیمز کی کتاب زیادہ محققانہ نظر آتی ہے۔ اس کتاب میں بلوچی شاعری مضمون اور اظہار بیان کے اعتبار سے سادہ اور سلیس ہے اور زندگی و ملکی ماحول کی سچی عکاسی کرتی ہے۔ یہ عین قدرتی عمل ہے کہ بے آب و گیاہ چٹیل پہاڑوں، وسیع دامانوں اور ریگستان میں زندگی بسر کرنے والا شاعر ہمیشہ بارش اور باد و باران کے طوفان کی تمنا کرتا ہے۔ سرسبزی اور شادابی اور خوشحالی کا آرزومند رہتا ہے۔ اپنی خواہش کے مطابق خشک دریاؤں کو پانی سے لبریز دکھاتا ہے اور چٹیل میدانوں اور پہاڑوں کے بے آب و گیاہ دامنوں کو سبز قالین میں منتقل کرتا ہے۔ پانی سے لگاؤ ہے لیکن قحط سالی میں پانی کی ایک بوند کی اہمیت ان کے ہاں موتی سے بھی انمول ہے۔ وہ ایک کٹورے کے بدلے سو سال وفا کی بات کرتا ہے جو عطا شاد کے اس شعر سے واضح دکھائی دیتی ہے۔

میری زمین پر ایک کٹورے پانی کی
قیمت سو سال وفا ہے
آؤ! ہم بھی پیاس بجھائیں
زندگیوں کا سودا کر لیں۔

بلوچی شاعری میں خودداری، انانیت، قوم پرستی اور عسکریت کا سبق ملتا ہے۔ بلوچ شاعر فطرت سے اثر پذیر نظر آتا ہے اور اس کی ترجمانی کرتا ہے اس کی شاعری میں تلواروں کی

جھنکار بھی ہے، محبت سے لبریز دلوں کی پکار بھی ہے، کامیابی کی فتح پر جشن بھی ہے، ناکامی و مایوسی کی آہ بھی ہے اور موسم بہار کی چاہ بھی ہے۔ بلوچ شاعر پہاڑوں، وادیوں اور دشت و صحرا میں اپنے مال مویشی کے پیچھے گھومتا پھرتا اور اپنے اردگرد بود و باش رکھنے والے چرند و پرند کے علاوہ موسمی تغیرات، بادل، بارش، کہر، بجلی کی چمک، گھنگھور گھٹاؤں کی کڑک، تند و تیز آندھی، جھکڑ، طوفان اور بپھرے ہوئے پہاڑی ندی نالوں کی آواز، موسم بہار کے پر کیف نظاروں گواڑخ کے پھول، سبز گھاس، جنگلی جڑی بوٹیوں اور پھولوں کی مہک، درختوں کے میوہ جات، اور پھر گرمیوں میں شعلہ برساتی ہوئی لو، سردیوں کے موسم میں شمال کی جانب سے سرد ہوا گورپچ جو ہڈیوں کے گودے تک جمادیتی ہے اور قدرت کے وہ تمام مناظر جو شب و روز ان کی آنکھوں کے سامنے رہتے ہیں۔ ان ہی میں سے وہ اپنی تشبیہوں اور استعاروں کا انتخاب کرکے اور کمال فن سے ان کو اشعار میں ڈھال کر نہایت خوبصورتی سے پیش کرتا ہے۔ عہد چاکری سے لے کر بیسویں صدی کی پچاس کی دہائی تک بلوچی ادب نے بڑے نشیب و فراز دیکھے۔ واحد بخش بزدار لکھتے ہیں۔ "چاکری عہد سے لے کر قیام پاکستان سے چند سال پہلے تک بلوچی شاعری محبت و مزاحمت کے شعری رویوں اور رجحانات کی غماز تھی اور قیام پاکستان کے بعد محبت مزاحمت کا یہی رویہ ایک نئی روایت اور نئی مزاحمت میں ڈھلتا نظر آتا ہے۔ یہ نئی روایت اور نئی مزاحمت پورے بنی نوع انسان سے محبت سمیت استحصال، طبقاتی جبر و امتیاز، ظلم و تشدد، عدم مساوات، ناانصافی اور ہر قسم کی بدصورتی اور بدوضعی کے خلاف ایک اجتماعی اور عالمگیر اظہار کی حیثیت رکھتی ہے"۔

بلوچی ادب کے بارے میں بلوچی زبان میں دستیاب ثبوت کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت ہمیں انیسویں صدی کے جو تمان گلستی اور کمالان گچکی کے مسودے اور اس کے علاوہ برٹش میوزم میں 1861 میں انگریز بیوہ سے خریدا ہوا مسودہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ بیسویں صدی کے اوائل کے مسودوں کے متعلق سید ظہور شاہ ہاشمی رقمطراز ہیں" بائبل سوسائٹی کراچی سے مجھے انجیل کے نسخے بھی مل گئے تھے جو اس صدی کے اوائل میں چھپ چکے ہیں۔ کراچی سے دو ایک ترتیب الصلوٰۃ جیسے مذہبی کتابچے بھی مجھے 1950 سے پہلے کے چھپے ہوئے دستیاب ہوئے، تقسیم ہند سے پہلے دوسری عالمی جنگ کے دوران کوئٹہ یا بولان سے چھپنے والے دو جریدوں میں بھی کبھی کبھی بلوچی نثر کی چیزیں دیکھی تھیں۔ اسی طرح ان ہی زمانوں میں کراچی سندھ مدرسہ

الاسلام کے ایک سالنامے (کرانیکل) میں بھی میں نے ایک آدھ مضمون بلوچی میں چھپا دیکھا۔ بیسویں صدی کی ابتداء میں ہی مکتبہ درخانی نے بھی بلوچی زبان کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ اس ادارے نے مولوی حضور بخش جتوئی کی مذہبی کتب بلوچی میں شائع کرائیں۔ مولوی موصوف نے شروع میں کتاب قدوری کا عربی سے بلوچی میں ترجمہ کیا۔ شمائل شریف جو عربی میں ہے۔ اس کا بلوچی میں منظوم ترجمہ کیا،اسی طرح خلاصہ کیدانی ،میرۃ المصطفیٰ ،روضۃ الاحباب اور مکاتب صادقین جو عربی زبان کی مستند درسی کتب ہیں۔ موصوف نے انہیں بلوچی میں ترجمہ کیا۔ اسی طرح حکایات عجیبہ ،خاکساری قریب ،ہدایت ابدی اور اصول الصلوۃ وغیرہ مولوی حضور بخش کی منظوم تصانیف ہیں۔

بلوچی ادب کے فروغ کی باقاعدہ اور شعوری جدوجہد کا آغاز ہمیں بیسویں صدی کی پانچویں اور چھٹی دہائی میں طویل و کٹھن سفر کے بعد متحرک ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ کراچی اور کوئٹہ سے ریڈیو سے بلوچی نشریات کا آغاز اور بلوچی زبان وادب کے فروغ کے لئے تنظیموں کا قیام اور بلوچی رسالوں اور مجلوں کی اجراء نے بلوچی زبان کے نثری ادب کو نئی جہت کے مواقع فراہم کئے۔ کراچی میں اسی دہائی میں بلوچی حلقہ ادب ،بلوچی بزم ادب ،بلوچی ادب مجلس ،سرچنگ ،بلوچی ادبی بورڈ ،بلوچی اکیڈمی وغیرہ جیسی ادبی تنظیمیں بھی قائم ہوئیں۔ اس دوران کراچی ہی سے ریڈیو سے بلوچی نشریات نے ان ادبی تنظیموں کی تخلیقی عمل کو تقویت دی کیونکہ اس وقت ضرورت محسوس کی گئی کہ ریڈیو کے پروگراموں کے لئے ترتیب دیئے گئے مقالوں، مضامین اور ڈراموں کے معیار کو بہتر بنایا جائے۔ اس ماحول میں نئے اور جدید ادب کو فروغ ملا اور نثر اور نظم میں نئی اصناف کا متعارف ہوئیں۔ مثلاً غزل ،رباعی ،فیچر ،افسانہ ،ڈرامہ ،مقالہ ،مزاحیہ ادب وغیرہ ،پھر کراچی میں 1957 میں "بلوچی ادبی دیوان" کے نام سے ایک اور ادبی ادارہ بنایا گیا اسی ادارے نے بلوچی کے نامور شاعر و نقاد میر گل خان نصیر کا شعری مجموعہ "گلبانگ" شائع کیا، اس کے ساتھ ساتھ رسالوں کے اجراء کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ لالہ غلام محمد شاہوانی نے اپنے اخبار "نوائے وطن" میں بلوچی زبان میں لکھنا شروع کیا ہے۔ 1951 میں مولانا خیر محمد ندوی "اومان" اور 1956 آزات جمالدینی ماہنامہ "بلوچی" کا اجرا کرتے ہیں پھر یہ سلسلہ آدینک ،آسماپ ، اولس ،ہام ، ہامسار ، بانگواہ ، بلاہوٹ ، براز ، برمش ، بلوچی گوانک ، چاگرد ،بلوچی دنیا ، بلوچی

لبزانک، بتدیگ، بوژان، بہارگاہ، بجتان، جالار، چاگرد، درخشان، روژن، چراگ، چنگ، دروچ، زمانہ، زندان، ساچان، سچ، سنگار، سوب، سوغات، شنیدان، شیپنگ، سمین، شوہاز، شم، صدائے بلوچ، کاروان، کیچ، گچین، گوانک، لبزانک، بلدرد، مابکان، مستاگ، منگوسر بلوچستان، معلم مکران، منزل، مئے بلوچستان، مئے کاروان، میار، بجتاپ، نوائے وطن، نوکیں دور، یہ تی تاریخ، یاگی، بلوچیاء سچکان، استین، باھڑی، بلوچی چاگرد، سنگار، آدینک، بہار، بلوچی زند، سنگت، مہرتاب، ملگور، گوہر، ارجل، دریں وغیرہ کے ذریعے مسلسل اشاعت والے یا تعطل کا شکار یا چند ایک شماروں کے بعد بند ہونے والے رسائل و جرائد کے ساتھ بلوچی کے تحریری ادب نے نیا سفر کا آغاز کیا اور یہ سفر اب تک جاری و ساری ہے۔ اس کے علاوہ 1958 واجہ عبدالقیوم کی جدوجہد سے قائم ہونے والی بلوچی اکیڈمی قائم ہوئی۔ ان کے پابند سلاسل ہونے کے بعد 1961 میں باقاعدہ طور پر بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ بلوچی زبان و ادب و ثقافت کے فروغ کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ جس نے قیام سے اب تک پانچ سو سے زائد کتب شائع کی ہیں۔ اس کے علاوہ بلوچستان اکیڈمی تربت، سید ظہور شاہ اکیڈمی گوادر، ملا فاضل اکیڈمی، فاضل ادبی کاروان، عزت اکیڈمی پنجگور، راسکوہ ادبی دیوان، سنگت اکیڈمی، نصیر کبدانی لبزانکی دیوان، مہردر پبلیکیشنز بانک سوشل ویب سائیٹ کے ساتھ تین درجن سے زائد ادبی مجلے و رسالے و ایک درجن کے قریب ادبی ادارے بلوچی زبان، ادب و ثقافت کے فروغ کے عملی جدوجہد شامل ہیں۔

حوالہ جات:

1۔ عبدالرحمٰن غور۔ 1968۔ غم و کوہسار، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ۔ ص۔ 18

2۔ میر گل خان نصیر۔ 2005۔ اشاعت دوئم، بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔

3۔ میر مٹھا خان مری۔ 1987۔ در گچین۔ اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد۔ ص۔ 26

4۔ سید ظہور شاہ ہاشمی۔ 1986۔ ص 269-270

5۔ میر مٹھا خان مری۔ ادب ثقافت ادبی دیوان میں ادارہ ثقافت کوئٹہ۔ ص۔ 104

6۔ شاہ محمد مری، ڈاکٹر۔ 2009۔ ص۔ x

7۔ غفور شاد۔ 2014۔ بلوچی کلاسیکی شاعری، بلوچستان اکیڈمی، تربت۔ ص۔ 104

لوک کہانی

لوک کہانی عمومی اور وسیع المعنی اصطلاح ہے جس کے دائرے میں قصہ کہانی کی عام صورتیں شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کہانی اور انسانی تہذیب ہم عمر ہیں۔ اقوام عالم کے کہانیوں اور خصوصی طور پر لوک کہانیوں میں لین دین کا عنصر دیکھا گیا ہے۔ لوک کہانیاں انسانی زندگی کے ہر عہد میں اپنی سادگی اور خصوصیت کی وجہ سے ممتاز رہی ہیں۔ لوک کہانی میں اس خاص سرزمین کا ایک مخصوص عکس دکھائی دیتا ہے۔ کہانی کے ابتدا کے بارے میں شے رکام لکھتے ہیں۔

کہانی کی ابتدا اتنی قدیم ہے جتنا انسان خود ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ اس کی ابتدا کب ہوئی ہے۔ ہاں قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کہانی کی ابتدا اس وقت ہوئی جب انسان نے ابھی زندگی کا آغاز نہیں کیا تھا اور جنگلوں میں بھٹکا کرتا تھا۔ کچھ کہتے ہیں کہ اس کی ابتدا پانچ لاکھ سال پہلے ہوئی اور کچھ بتاتے ہیں پچاس لاکھ سال پہلے ہوئی۔ جب انسان نے بات سیکھنے اور ایک دوسرے سے ہمکلام ہونے لگا اسی دور میں کہانی کی ابتدا ہوئی(1)۔

لوک کہانیاں چونکہ انتہائی سادہ اور تصنع سے پاک ہوتی ہیں۔ اس لئے ہمیں ان میں دیس یا قوم یا قبیلے کی دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ وہ انسان کی محبت کی بے لوث ترجمان ہیں۔ آج کی تہذیب میں دنیا میں مختلف ممالک اور قوموں میں دوریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ مگر جن سادہ اور بے لوث انسانوں کی انسانیت کی ترجمانی یہ کہانیاں کرتی ہیں وہ ان لوگوں کی دوریوں کے باوجود ایک دوسرے سے قریب ہیں۔ وہ آج بھی ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سنتے ہیں اور انھیں وہ اپنے دل کی دھڑکنیں محسوس کرتے ہیں(2)۔

قصہ (کہانی) کو بلوچی زبان میں "کسہ" اور لوک کہانی کو "ایدی کسہ" بھی کہا جاتا ہے جو بلوچی ادب میں اہم مقام رکھتا ہے۔ ہر زبان کا قدیم ترین ادب لوک گیت، لوک کہانیاں، ضرب

الامثال اور کہاوتیں وغیرہ ہوتی ہیں۔ لوک کہانی ہر عہد میں موجود رہی ہے۔ اس میں ہر دور کا تھوڑا سا رنگ شامل ہوتا ہے۔ ان میں بلوچ معاشرت اور مجلسی زندگی کا عکس ہے اور بلوچی اخلاقی اقدار بھی سامنے آجاتی ہیں۔

ہماری ابتدائی لوک کہانیوں میں ہمیں زرتشتی عہد سے لے کر بدھ ازم تک کا زمانہ ملتا ہے۔ جہاں بس فطرت ہے اور انسان، فطرت کی مہربانیاں ہیں اور انسان، اور فطرت کی قہرمانیاں ہیں اور انسان ہیں۔ رد کشمکش ہیں۔ انسانی جنگ و استقلال کے مظاہر ہیں۔ فطرت کی ہر شیطانی سوت سے ٹکرانے کے بعد انسان ہی کامیاب و سرخرو ہوتا ہے۔ انسانی آبادیوں سے ہزاروں میل دور عبادت میں مصروف فقیر ہیں۔ جوگی ہیں، بھائی چارہ، باہمی مدد اور غیر طبقاتی معاشرہ قائم ہے۔ جہاں نیکی ہی نیکی ہے۔ بعد ازاں بلوچ بادشاہی نظاموں کے ساتھ سامنے آئے تو پھر یہ لوک کہانیاں اس عہد کی عکاسی کرتی نظر آتی ہیں۔ بھی بادشاہ صرف مغل درباروں میں ظل الٰہی نہیں ہوا کرتا تھا وہ اپنا نظریاتی عکس قدیم بلوچی ادب میں بھی ڈالتا رہا ایک بادشاہ تھا، بادشاہی تو خدا کی ایسی ہے کہ جس نے بغیر کسی سہارے کے آسمان کو کھڑا کیا ہوا ہے۔ ہر ایک اپنی زمین کے ٹکڑے کی بادشاہی کرتا ہے، ہمارے بادشاہ میں عقل کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے رہی سہی کسر اس کا دانا وزیر پوری کر لیتا ہے۔ بادشاہ مردانہ وجاہت سے بھی مزین ہوتا تھا، جواں مردی، شمشیرزنی، گھڑسواری، عاشقی، بہادری، ہمت، قوت فیصلہ اس کے خداداد اوصاف میں ہوا کرتے۔ ساری قسمت اسے میسر تھی (3)۔

بلوچی میں لوک کہانیوں کی ترقی میں بوڑھی عورتوں (دادیوں اور نانیوں) کا اہم کردار رہا ہے۔ انہوں نے اپنے پوتے و پوتیوں اور نواسے و نواسیوں کو پند و نصیحت کی قسم قسم کی کہانیاں سنائیں۔ خصوصی طور پر سردیوں کی لمبی راتوں کو گزارنے کے لئے آگ کے ارد گرد محفل جما کر ناقابل فراموش کہانیاں نئی نسل کو منتقل کی جاتی تھیں۔ بلوچی زبان کی ان لوک کہانیوں میں فطرت کے خلاف انسان کی جدوجہد کی بھی مثالیں موجود تھیں۔ بادشاہ کا اپنے ارد (یعنی فوج) کے ساتھ جنگل جانے کا تذکرہ بھی تھا۔ نگہبارے کی اپنے حوالے سے نئے نئے اوزار اور وسائل کے ساتھ فطرت پر فتح مند ہونے کی کہانی بھی تھی۔ کسان کاشتکاری کی نئی نئی اقسام اور آلات وضع کرتا رہتا تھا اور ہر لحاظ سے فطرت کو اپنا مطیع بنانے کا قصہ بھی تھا چرواہے کا جنگلی حیوانات کو پالتو بنانے

کی بات بھی تھی اور درندے (کتے) کو چوکیدار، اور اپنے دشمنوں (بھیڑیوں، گیدڑوں، لومڑیوں، گوہوں) کے خلاف نئی نئی ٹیکنالوجی سے مسلح ہونے کی حکمت عملی بھی موجود دکھائی دیتی ہے۔ یوں وہ گھاس، اس کی اقسام اور چراگاہوں کی موجودگی کے علوم حاصل کرتا جاتا ہے۔ اس دور کی کہانی درندوں، پرندوں، درختوں اور پتھروں کو بھی کردار بناتی ہے۔ ان سے بات چیت کرتی ہے۔ اس سے انسان کی طرفداری یا دشمنی کرواتی ہے۔ انہیں آپس میں محبت یا عداوت میں دکھاتی ہے۔ بعد کی لوک کہانیوں میں وطن، آزادی، قبضہ گری، حب الوطنی کی باتیں ہوتی ہیں۔

بلوچی کہانیوں کی تحریری طور منظر عام پر آنے کا سلسلہ بھی اٹھارہویں صدی میں 1763 میں ہوتمان گلستی کے قلمی نسخے سے انیسویں صدی کے فرنگی افسران کے تحاریر و کتب سے بیسویں صدی کے ادبی اداروں کی تشکیل کے بعد کتابی سلسلوں تک جا پہنچی ہے۔

کہانیوں کے فروغ اور انہیں ترقی دینے اور انہیں گم و ضائع ہونے سے بچانے کا ابتدائی کام اٹھارویں صدی عیسوی میں شروع ہوتا ہے۔ بلوچی ادب کا ملنے والا ابتدائی قلمی نسخہ جو 1763 میں ہوتمان گلستی نے لکھا۔ جس میں تاریخی واقعات، بلوچی ضرب الامثال و کہاوتیں، کہانی و جنگی داستانیں موجود ہیں۔ بلوچی کہانیوں کے فروغ میں اہم کردار انگریز پولیٹیکل افسران کا بھی رہا ہے۔ جنہوں نے انیسویں اور بیسویں صدی میں اپنی تحریر کردہ کتب میں بلوچی کہانیاں بھی شامل کی ہیں(4)۔

بلوچی لوک کہانیوں میں ہمیں بادشاہوں کے قصے، دیو و بلاؤں کے قصے، پریوں کے قصے، پند و نصائح کے قصے، حیوانوں کے قصے، بچوں کے قصے، ماحول و قومی قصے و دیگر قصے شامل ہیں۔

بادشاہوں کے قصے

بلوچی کہانیوں میں بادشاہوں میں عقل کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ مردانہ وجاہت سے مزین بادشاہ جواں مردی، شمشیر زنی، گھڑ سواری، عاشقی، بہادری، ہمت، قوت فیصلہ کی خداداد صلاحیتوں کے اوصاف کے ساتھ سے ہوتا ہے۔ وہ قسمت کا دھنی، کرامات سے بھرپور، لشکر، اسلحہ اور طاقت کا منبع دکھائی دیتا ہے۔ بلوچی کہانیوں کا بادشاہ کے بارے میں کہا جاتا ہے۔

ان کہانیوں سے واضح ہوتا ہے کہ بادشاہ اچھے کردار کا مالک ہوتا ہے۔ وہ جہاندیدہ، نیک دل اور نیک نیت شخص ہوتا ہے۔ اسے اپنے ماحول کی اچھائی اور برائی کا علم ہوتا ہے۔ بادشاہ میں عقل و دانائی سب سے زیادہ ہوتی ہے، اکثر وہ کرامات سے بھرا ہوتا ہے۔ خداوند کریم نے اسے تمام خوبیاں بخش دی ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بادشاہ بعض کہانیوں میں مظلوم بھی نظر آتا ہے۔ کبھی کبھار ان کی اولاد نہیں ہوتی یا اس کا بچہ بلا دریو کے پاس ہوتا ہے یا ان کی بیٹی کی شادی جن، بلا یا خونخوار حیوان کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ بادشاہی قصے دیگر کہانیوں سے دلکش اور نمایاں ہوتے ہیں (5)۔

دیو و بلاؤں کے قصے

قدیم کہانیوں میں دیو، بلا و جنات کے قصے بلوچی لوک کہانیوں کا حصہ ہیں۔ ان میں انسان اپنی زندگی میں اچھائی کی جانب جب قدم اٹھاتا ہے تو وہ کسی نہ کسی طرح، کہیں نہ کہیں بدی ان کے سامنے آ جاتی ہے۔ یہ جن، دیو و بلا کہیں ظالم، کہیں رحم دل اور معاون ہوتے ہیں۔ ان کہانیوں میں ان کو نیک اور بد دونوں دکھائے گئے۔

بلوچ روایتوں میں جن و بلاؤں کا تصور موجود ہے کیونکہ وہ اپنی خانہ بدوشانہ زندگی میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرتے ہیں۔ جب کہیں وہ پھنس جاتے ہیں تو وہ تصور کرتے ہیں کہ یہ رکاوٹ جن و بلاؤں کی وجہ سے رکاوٹ ہے۔ اسی طرح بلوچ روایتیں بھی میں دیو و بلا تعلق رکھتی ہیں۔ اس لئے بلوچی کہانیوں میں دیو و بلا و پریوں کے قصے بڑی تعداد میں ملتے ہیں" (6)۔

پریوں کے قصے

کوہ قاف کی پریاں دیگر زبانوں کی طرح بلوچی ادب میں بھی کہانیوں کا حصہ ہیں۔ ان کہانیوں میں بلاؤں طرح پریاں بھی انسانوں سے بات چیت کرتی ہیں، رشتے داری اور شادیاں بھی کرتی ہیں۔ پریوں کی خواہشات بھی انسانی خواہشات کے طرح ہوتی ہیں۔ اکثر کہانیوں میں پری آدم زاد کی ضروریات کو پورا کرتی ہیں جیسا کہ بیمار کا علاج اور خوش نصیبی کے لئے پری کے ہاتھ کی انگوٹھی۔ پھر ایسی چیزوں کی کھوج صرف کوہ قاف میں ہو سکتی ہیں۔ ان اشیا کے حصول کے لئے بہادر افراد بہت سی مشکلات کا سامنا کرتے ہیں۔ کئی دن، کئی رات، مہینوں اور سالوں کے سفر کے بعد تکالیف جھیل کر وہ کوہ قاف پہنچتے ہیں اور اپنے مقصد پا لیتے ہیں۔

پند و نصائح کے قصے

نصیحت آموز قصے انسانی زندگی کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔ دنیا کی اکثر کہانیاں انسان کے پند و نصائح کے لئے لکھی گئی ہیں۔ معاشرے میں اچھائی ہو یا برائی ویسے ہی کہانیاں لکھی جاتی ہیں جن کے آخر میں میں انسان کے لئے نصیحت آموز سبق ہوتا ہے۔ بہت ساری بلوچی کہانیاں حکایت پر مبنی ہیں جن میں انسان کو لالچ، خود غرضی، حوس اور دیگر بدیوں سے دور رہنے کی تلقین کی جاتی رہی ہے۔

بلوچی کہانیوں میں پند و نصائح بھرپور انداز میں دکھائی دیتا ہے۔ اگر باریک بینی سے دیکھا جائے تو تاریخ میں انسانی زندگی سے وابستہ بہت سارے حقیقی واقعات پر مبنی کہانیاں بنائی گئی ہیں۔ ان کہانیوں میں بتایا جاتا ہے کل کیا ہوا تھا اور آئندہ کیا ہوگا۔ ان کہانیوں میں انسان اپنے اجداد کی کارستانیوں سے آشنا ہو جاتا تھا (7)۔

حیوانات اور جانوروں کے قصے

انسان کی ابتدائی جنگلی زندگی سے ماضی قریب کی دیہی زندگی میں انسان اور حیوانات کا تعلق رہا ہے۔ مصری، یونانی، افریقی اور ہندوستان کی کہانیوں میں حیوانات اور جانوروں کی کہانیاں ملتی ہیں۔ بلوچی زبان کے کہانیوں میں شیر، لومڑی، بیل، چیونٹی، بلی، بکری، بھیڑ، خرگوش وغیرہ کی اچھائی اور برائی کو پیش کیا گیا ہے۔ ہر جانور اپنے ماحول کے مطابق اپنا اپنا کردار ادا کرتا ہے، ان کی خوراک الگ، ان کے شکار کا طریقہ جدا ہوتا ہے۔ کمزور جانوروں کی کمزوری اور خونخوار حیوانات کے خوف کو واضح کیا گیا ہے۔

بچوں کے قصے

بچوں کی کہانیاں بڑی اہمیت کے حامل ہوتی ہیں، ان میں بچوں کی نفسیات اور ان کی پرورش اور تربیت کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ صبر و محبت، خوشی و غمی، درد و رنج، علم و تحقیق انسانی تجسس و زندگی سے جڑی ہیں۔ ایک فرد جیون کے ان پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اپنی نئی نسل کی اخلاقی تربیت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بچوں کی کہانیاں بھی اس سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ان میں نیکی، سچائی، دانائی، اخلاقیات، ہمدردی، صفائی وغیرہ جیسے عنوانات کے ذریعے پند و نصائح کا سلسلہ قائم رکھا جاتا ہے۔ چھوٹوں کے ساتھ شفقت، ہم عمروں کے ساتھ مروت اور بڑوں کی عزت کا درس بھی ہوتا ہے تاکہ آگے چل کر وہ بچہ ایک کارآمد شہری بن کر ملک و قوم کی خدمت کر سکے۔

یوں بچے ان کہانیوں کے کردار پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس کردار میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

معاشرتی قصے

لوک کہانیاں ہر عہد میں موجود رہی ہے۔ اس میں ہر دور کا تھوڑا اسا رنگ شامل ہوتا ہے۔ ان میں بلوچ معاشرت اور مجلسی زندگی کا عکس شامل ہے۔ بھائی چارہ، باہمی مدد، باہمی احترام اور اجتماعیت پر مبنی قبائلی جمہوری معاشرے کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے۔ اغیار کی مدد سے مسلط کردہ غیر جمہوری اور غیر متوازن دور اور پھر بلوچ سماج میں بادشاہت کے قیام تک ہر دور کی معاشرتی پہلو بھی اس کے دامن میں موجود ہیں۔ یوں بلوچی کہانیاں اپنے ماحول، ثقافت، زندگی کے ہزارہا سال کی آئینہ دار ہیں۔

بلوچی لوک کہانیوں کے فروغ میں بلوچی زبان کے ادبی ادارے، بلوچی اکیڈمی کی کاوشیں ناقابل فراموش ہیں۔ آیئے اب ہم بلوچی زبان میں شائع لوک کہانیوں کے کتب پر نظر ڈالتے ہیں

ب لوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے لوک کہانیوں کی کتب میں 1980 میں صورت خان مری کی "عہدی کسہ" (قدیم کہانیاں) اسی سال میں صورت خان مری کی دوسری کتاب "پریانی کسہ" (پریوں کی کہانیاں) اور "عشقی کسہ" (عشقیہ کہانیاں) 1980 میں بانک م سلطانہ کی "موربک"، "موکو چینگ وکسہ"، "پریوں کی کہانیاں" اور "بلوچی عشقیہ" کہانیاں شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ لانگ ورتھ ڈیمز کی کہانیوں کا ترجمہ ملک محمد پناہ کی کتاب "گیدی قصہ اولی" (لوک کہانیاں اول) 2014/1968 میں، محمود خان مری کی "گیدی قصہ دومی" (لوک کہانیاں دوئم) 1968 میں، امان اللہ غازی کی "گیدی قصہ سمی" (لوک کہانیاں سوئم) 1971 میں، گلزار خان مری کی "گیدی قصہ چہاری" (لوک کہانیاں چہارم) 1971 میں، حاجی محمود مومن بزدار کی "گیدی قصہ پنچمی" (لوک کہانیاں پنجم) 1970 میں، محمود خان مری کی "گیدی قصہ ششمی" (لوک کہانیاں ششم) 1971 میں، عاقل خان مینگل کی "گیدی قصہ ہفتمی" 2011/1971 میں، حاجی مومن بزدار کی "گیدی قصہ ہشتمی" (لوک کہانیاں ہشتم) 1973 میں، گلزار خان مری کی "گیدی قصہ نہمی" (لوک کہانیاں نہم) 1974 میں شائع ہوئیں۔ پہلیوں اور ضرب الامثال کی کتب میں

غوث بخش صابر کی کتاب "بتل و گالوار" (پہیلیاں اور ضرب الامثال) 1969 میں اور اسی مصنف کی "چاچ و بند" (کہاوتیں) 2013/1973 میں، محمد قاسم مینگل کی "گوگ ءِ زبان" 1996 میں بلوچستان بلوچی، براہوی بورڈ کی جانب سے، گلزار خان مری کی "گوشتن" (کہاوتیں) 1982/2005 میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے، اسحاق ساجد بزدار کی کتاب "بتل و گالوار دومی" 1997 میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے، رمضان بامری کی کتاب "گنج گوہر" 2008 میں سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ کراچی کی جانب سے، رشید خان کی کتاب "بتل، گوشتن، پجّار اِنت، گُشت" 2010 میں وفا لبزانکی مجلس، تمپ کی جانب سے، عبدالغفار ندیم کی کتاب "نگرِ سر" 2010 میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے اور قدیر لقمان کی کتاب "بتل ربیدگ و ہنرءُ" 2010/2012 میں بلوچستان اکیڈمی تربت کی جانب سے، شے رگام کی کتاب "بتل، گوشتن ءُ گالبند" 2012/2017 میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے شائع ہوئی ہیں۔ غلام فاروق کی کتاب "بتل گنج" 2011 میں سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ کراچی سے شائع ہوا جبکہ شعبہ بلوچی، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ کی جانب سے 2012 میں آر دلاور کی کتاب "قصہ ہلاس نہ بیت" اور رحیم مہر کی کتاب "گوہر قیمتی" شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ قدیر مجید کی کتاب "چاچ گنج" 2013 میں سید ریفرنس لائبریری کی جانب سے، شے رگام کی ضخیم کتاب "بادشاہ عبداللہ وحدت ات" لوک کہانیوں کا خوبصورت مجموعہ 2015 میں بلوچی اکیڈمی کی جانب سے۔ علی جمہ زعمرانی کی کتاب "سوداگر (اوّلی)" 2015 میں میراث پبلی کیشنز، کیچ کی جانب سے، علی جمہ زعمرانی کی کتاب "سوداگر (دومی)" 2016 میں بہارگاہ چاپ و شنگ، حب کی جانب سے، رشید خان کی کتاب "گلچین گیدی کسہ" 2016 میں وفا لبزانکی مجلس، تمپ کی جانب سے، عبدالکریم کی کتاب "چاکر چارچم" 2016 میں اتحین شنگ کار، کیچ کی جانب سے، ہیزن بلوچ کی کتاب "پنت کسہ" 2016 میں، رمکیں چاپ و شنگ، کراچی، اسحاق رحیم کی کتاب "بلوچی بتل" 2017 میں ادبگر کلستی اکیڈمی، پلیری گوادر کی جانب سے، ہیزن صباحی کتاب "مہرگ" 2017 میں بلوچستان اکیڈمی تربت سے جبکہ علی جمہ زعمرانی۔ بانک گل نسا کی کتاب "سوداگر (سومی)" 2018 میں بہارگاہ چاپ و شنگ، حب کی جانب سے شائع ہو کر بلوچی ادبی خزانے کا حصہ بن چکی ہیں۔

حوالہ جات:

1۔ شے رگام۔2015۔ روشنائی ءُ نمونات۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ ص۔ 3

2۔ جمیل زبیری۔2015۔ بلوچستان کی لوک کہانیاں۔ لوک ورثہ اسلام آباد۔ ص۔ 2

3۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری۔2009۔ مختصر تاریخ زبان وادب بلوچی، مقتدرہ قومی زبان پاکستان اسلام آباد۔ ص۔ 23

4۔ منیر احمد۔2020۔ بلوچی قصہ: تحقیق ءُ رہبری۔ بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ۔ ص۔22

5۔ منیر احمد۔2020۔ بلوچی قصہ: تحقیق ءُ رہبری۔ بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ۔ ص۔66

6۔ ڈاکٹر عبدالصبور بلوچ۔2009۔ بلوچی قصہ ئی لبزانک۔ بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ۔ ص۔ 53

7۔ مجید بلوچ۔2021۔ کتاب گنج۔ شعبہ بلوچی، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ

8۔ عرفان جمالدینی۔2021۔ کتاب شون۔ بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ

ضرب المثل

محاورے، کہاوتیں اور ضرب الامثال کسی بھی زبان کا قیمتی اثاثہ ہوتے ہیں۔ بلوچی وسیع زبان ہونے کے علاوہ ایک شیریں زبان بھی ہے۔ اس میں اس صنف کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے جو زندگی کے وسیع تجربات و مشاہدات پر مشتمل ہیں۔ ان میں آفاقی باتیں بھی موجود ہیں تو اخلاقی باتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ جو مختصر ہوتی ہیں اور موسیقیت بھری بھی۔ دنیا کے بہت وسیع خطے میں بلوچ آباد ہیں ج کا بہت عرصے تک باہمی رابطہ نہ رہا اس لیے ہر خطے کے بلوچوں نے اپنی اپنی ضرب الامثال بنا رکھی ہیں۔ اب اگر ان سب کو ملا دیا جائے تو نا قابل تصور ضخیم کتاب بن جائے گی۔ اگر بلوچی ضرب الامثال پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات ظاہر ہے کہ ان سے بلوچ قوم کی تاریخ و واقعات، بلوچ عوام کی ثقافت، رسوم و رواج، طبیعت اور نفسیاتی قدروں کی نشاندہی ہوتی ہے۔

بلوچ معاشرے میں ضرب المثل کو خاص اہمیت حاصل ہے، جو تخلیقی اہمیت بلوچ سماج میں ضرب المثل کی ہے کسی اور صنف کی نہیں ہے۔ زندگی کے تمام پہلوؤں پر بلوچوں کے پاس ذو معنی اور دلکش ضرب الامثال ملیں گے۔ وہ نفسیات سے متعلق ہوں یا اقتصادیات سے متعلق، سماجیات سے متعلق ہوں یا ثقافت سے متعلق یا زندگی کے دیگر پہلوؤں کے بارے میں۔ بلوچ کا ہر احساس و مشاہدہ ضرب الامثال میں ملے گا۔ حقیقت میں توجہ و تحقیق نہ ہونے کے باعث اس قیمتی خزانے کا بڑا حصہ اندھیروں کے سپرد ہو گیا۔ تاہم اب بھی ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کے سینے میں موجود ہیں اور روزانہ معمول کے مطابق زیر استعمال ہیں (1)۔

اکثر بلوچی ضرب الامثال صدیوں کے انسانی تجربات و مشاہدات کا ثمر ہیں۔ انسان اپنے روز مرہ زندگی میں بہت سے حقائق کا سامنا کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔ یہ حقائق اور مشاہدات آگے چل کر ضرب المثل کا جامہ پہن لیتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ بلوچی ضرب الامثال کا دامن بہت کشادہ ہے، اس میں مختلف اقسام کے جواہر قیمتی پائے جاتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان کے بارے

میں معلومات اٹی ہوئی ہیں۔ ہمارے محققین اپنے اجداد کے اس میراث پر اٹی ہوئی دھول کو ہٹا کر اسے آشکار کرنے میں کردار ادا کریں(2)۔

اکثر چھوٹے اور بڑے جملے میں ہوتے ہیں۔ اکثر موسیقی کے لے کے مطابق ہوتی ہیں جس کی وجہ سے لوگوں کو جلد ازبر ہو جاتی ہیں۔ جس شخص کو زیادہ ضرب الامثال یاد ہوتے ہیں ان کی محافل کشت زعفران کے مثل رہتی ہے۔ جس کے باعث لوگ ان کی محافل میں موجود رہتے ہیں۔ اس کی ہوئی چھوٹی سی بات بھی اہم اور معنی خیز ہوتی ہے۔ اکثر ضرب المثل اپنے لفظی معنی نہیں دیتیں بلکہ اس کے پس پردہ اپنے تشبیہ اور استعاراتی معنی رکھتے ہیں(3)۔

میرا اندازہ یہ ہے کہ بلوچستان کے تمام علاقے اور مقام جہاں پر بلوچی زبان بولی جاتی ہے کہ ضرب الامثال ڈھونڈ کر اکٹھے کئے جائیں تو بلوچی کے تمام ضرب الامثال کی تعداد دس ہزار سے زیادہ ہوگی۔ میرے اندازے کے مطابق بلوچستان کے قبائلی علاقوں میں زیر استعمال ضرب الامثال کی تعداد تین چار ہزار تک ہے کیونکہ ان میں سے بہت سے رسائل و جرائد میں شائع ہو گئے ہیں لیکن اب بھی لاتعداد ہیں جو شائع ہونے سے قاصر ہیں۔ لیکن عوام کے ہاں موجود ہیں۔ مجھے صرف مکران کے چند علاقوں کے مختصر سے سفر و قیام کے دوران پتہ چلا ہے کہ اس وقت ایسی ضعیف العمر خواتین ہیں کہ ان کو دو سو سے زیادہ ضرب الامثال یاد ہیں اور اکثر ایسے ضعیف العمر مرد اور خواتین دیکھے ہیں جن کو پچاس سے زائد ضرب الامثال یاد ہیں۔ میرے خیال کے مطابق اگر بلوچی ادب کی وسعت، بلوچ قوم کی قدامت اور شان و شوکت کے بارے میں اگر معلومات چاہئے تو اس کی بہترین عکاسی بلوچی ضرب الامثال میں نظر آئے گی(4)۔

غوث بخش صابر کی کتاب "بلوچی بتل و گالوار" شئے رگام کی کتاب "بلوچی بتل، گوشتن و گالبند" اسحاق رحیم کی ادا بگر گلستی اکیڈمی پلیری، گوادر کی جانب سے شائع کتاب "بلوچی بتل" اور قدیر لقمان کی کتاب "بتل ردیگ ءِ ہنرہ" قابل ذکر کتابیں ہیں۔

حوالہ جات:

1۔اسحاق رحیم۔2017۔بلوچی بتل،ادا بگر گلستی اکیڈمی پلیری، گوادر۔ ص۔8
2۔صورت خان مری۔2012۔ تحقیق و دانک۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔
ص۔241, 244,273
3۔ڈاکٹر فضل خالق۔ 2021۔ اس در۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ ص۔108
4۔ڈاکٹر شاہ محمد مری۔2009۔ مختصر تاریخ زبان و ادب بلوچی، مقتدرہ قومی زبان پاکستان اسلام آباد

پہیلی

پہیلی کو بلوچی میں "چاچ" کہا جاتا ہے اس کے علاوہ اسے بند اور بجھارت بھی کہتے ہیں۔ یہ صنف لوک ادب میں انتہائی اہم ہے کیونکہ چھوٹی عمر سے لے کر بوڑھے افراد بھی زندگی کے مختلف مراحل میں اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ پہیلی منظوم بھی ہوتی ہے اور نثری بھی۔ جس میں پہلا حصہ سوال ہوتا ہے۔ جس میں انوکھی اور تعجب خیز بات پوچھی جاتی ہے جو تجسس کو ہوا دیتا ہے۔ پہیلی کا دوسرا حصہ جواب ہوتا ہے۔ ٹیلی ویژن، کیبل اور جدید ٹیکنالوجی سے قبل بلوچ سماج میں گرمیوں کے شاموں اور سردیوں کے طویل راتوں کو محافل اور مجالس جمتی تھیں، جس میں بیک وقت لوک ادب کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی ہوتی تھی اور بعض دیہی علاقوں میں اب بھی کسی نہ کسی طرح یہ سلسلہ موجود ہے۔

چاندنی راتوں کو ایک طرف نوجوان جتو، دری جیسے کھیل میں مشغول ہوتے ہیں تو دوسری طرف دانشمند بوڑھی خواتین اپنے بچوں، پوتوں اور نواسوں کی تربیت کے لئے پہیلیوں، ضرب الامثال، قصہ و کہانیوں کے محفل سجاتی تھیں۔۔۔۔۔۔ پہیلیوں کے محافل کا آغاز محفل کے سربراہ کرتا تھا۔ محفل کے آغاز میں پہیلی کا آغاز کرتے ہوئے کہتے تھے پوچھنے والا شخص کہتا جو میری پہیلی بوجھے گا اسے تینتیس علاقے بخش دوں گا اور جو نہیں بوجھ پائے اس سے تینتیس علاقے لے لوں گا (1)۔

رات کو کھانے کے بعد دیہات میں جب بچے چھم پوٹ (آنکھ مچولی)، کھنج، ٹوپی لیو و دیگر ہیم آوٹ ڈور اور ہیم ان ڈور کھیلوں میں وقفے کے دوران پہیلی کے مقابلے شروع کر دیتے تھے۔ جوان اور بوڑھے مرد راتوں میں جب آگ کے چاروں طرف بیٹھتے تو لوک ادب کے اصناف پر طبع آزمائی کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات پیغام رسانی میں بھی اپنی پہیلیوں اور ضرب الامثال سے مدد لی جاتی تھی۔ اس کھیل کے دوران دونوں اطراف کے لوگ

خیالی طور پر دنیا کے بڑے ساہوکار اور دھنی بھی بن جاتے تھے۔ اگر کوئی پہیلی نہ بوجھ سکے تو کہتا کہ میں نے فلاں علاقہ آپ کو بخش دیا میں ہار گیا تو جیت گیا۔ اب مجھے اس کا جواب سنا دیں۔ پہیلی میں جواب لینا اور دینا لازمی ہوتا تھا۔ پہیلیوں میں کچھ ایسی پہیلیاں بھی ہوتی ہیں جو زبان زد عام ہوتی ہیں۔ کچھ پہیلیوں کے موضوعات اخلاقی ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ پہیلیاں بچوں کے کھیل، شعری، واقعاتی، تاریخی موضوعات کا احاطہ کرتی دکھائی دیتی ہیں۔

پہیلی زندگی کے قریب ترین پہلوؤں اور اشیا کے بارے میں کہی جاتی ہے۔ ضرب الامثال کی طرح پہیلیوں میں بھی بلوچ سماج کے تمام پہلوؤں جیسا کہ دوستی، دشمنی، انتقام، جنگ وجدل سمیت متعدد موضوعات ملتے ہیں۔ اسی طرح ان میں انسان و جانور، نہر دریا، پانی و نالے، جسم اور اس کے اعضا، کھانے پینے کے اشیا، گھاس پوس، درخت، گھریلو اشیا، زمین، آسمان، مہینے، دن، ستارے یعنی انسان سے جڑے دنیا کی کوئی ایسی چیز نہیں جس کے بارے میں بلوچی پہیلی نہ کہی گئی ہو بلکہ ایک ایک چیز کے بارے میں ایک سے زائد پہیلیاں موجود ہیں(2)۔

پہلے بلوچی زبان میں بے شمار پہیلیاں موجود تھیں لیکن جدید دور میں محافل کے طور اطوار تبدیل ہو رہے ہیں اور یہ گراں قدر سرمایہ قوم کے دسترس سے نکلتا جا رہا ہے۔ قدیم دور میں ایسی پہیلیاں دیہی کے مجالس کی جان ہوا کرتی تھیں جسے بوجھنے کے لئے آدمی آدھی رات تک سوچتا رہتا تھا۔ ان محافل میں پورا گاؤں اکٹھے ہوتا اور ایک پہیلی کہتا اور دوسرے حل کر بوجھتے اور جب نہ بوجھ پاتے تو شیر دے کر اس کے معنی پاتے۔ اب یہ روایت کہیں کہیں موجود ہے تاہم زندگی کے جھمیلوں کی وجہ سے معدوم ہوتی چلی جا رہی ہے(3)۔

پہیلیاں بلوچی زبان کے ادبی رسائل و مجلوں میں وقتاً فوقتاً چھپتی رہی ہیں تاہم کتابی شکل میں غوث بخش صابر کی کتاب "چاچ زبند" 1973/2013 میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے اور قدیر مجید کی کتاب "چاچ گنج" 2013 میں سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ کراچی جانب سے شائع ہو چکی ہیں۔

حوالہ جات:

1۔ قدیر مجید۔ 2013۔ چاچ گنج۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ کراچی۔ ص۔ 22

2۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔ ص۔ 39

3۔ غوث بخش صابر۔ 2017 اشاعت دوم۔ چاچ زبند۔ بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ۔ ص۔ 6

لوک شاعری

ہماری لوک شاعری نہ صرف شتربان کے طویل سفر کا ساتھی ہوتا ہے۔ بلکہ یہ تو قالین ساز اور دری بننے والے مردوزن کے خشک اور یکساں کام کو رنگین بناتا ہے، اسے مہمیز دیتی ہے۔ یہ شاعری ہماری لینڈ سکیپ کی توصیف ہے۔ ماحولیاتی حسن و سکون کا اظہار ہے۔ بارشوں کا انتظار ہے۔ سرسبزی کی دعا ہے۔ بلوچی لوک شاعری بادلوں کے اجتماع کا تذکرہ ہے، تبصرہ ہے، عرشی ایک ایک لمحے اور چیترے کا تذکرہ ہے۔ آسمانی رنگت کے بدلتے، اس کے صوتی و بصری کرشموں کی دفتر نویسی ہے۔ بارشوں کے بعد نم زمین کی بھینی خوشبو لے کر، سبزہ پھوٹنے سے لے کر اس کے پھول ہونے تک اور سبزہ سے ماحولیاتی حسن اور مویشی بانی تک کے ہر پہلو کا بیانیہ ہوتی ہے۔

اسی طرح بلوچی لوک شاعری کے میدان میں عطا شاد/ امین سلام کی "دریں" 1966/2001 میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے، غوث بخش صابر کی "ڈیہی دستانگ" 1971 میں، میر مٹھا مری کی "ڈیہی و صوت" 1980 میں، ڈاکٹر واحد بزدار کی کتاب "ڈیہی و درو شم" 2001 میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے شائع ہو چکی ہیں۔ فقیر شاد کی کتاب "ورنچ" 2003/2016/2017 میں فاضل ادبی کاروان سندھ نے شائع کی لوک گیتوں کے بارے میں اچھی کاوش کہلاتی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر فضل خالق کی کتاب "ہنگل انت تچ" 2007 میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے اور اسحاق رحیم کی کتاب "دمیانی میار" ملا ابا گر گلستی اکیڈمی بلیدی گوادر کی جانب شائع ہو چکی ہیں۔

حوالہ جات:

1۔ شاد محمد مری۔ 2014۔ بلوچی زبان و ادب۔ گوشہ ادب، کوئٹہ۔ ص۔ 114

2۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔ ص۔ 39

3۔ غوث بخش صابر۔ 2017 اشاعت دوم۔ چاپ و بند۔ بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ۔ ص۔ 6

صفت

صفت کو بلوچی میں "سپت " کہتے ہیں۔ سپت کا مطلب تعریف ہے۔ یہ وہ گیت ہے جو بچے کے پیدائش کے وقت گایا جاتا ہے، پیدائش کے دن سے لے کر نام رکھنے کی رسم "شششگان" کے دن تک روزانہ رات کو محفل سجا کر گایا جاتا ہے۔ عزیز و اقارب خواتین کے ساتھ ساتھ ہمسایے میں رہنے والی خواتین بھی اس محفل میں شامل ہوتی ہے۔ جس میں خداوند کی حمد و ثنا کی جاتی ہے اور زچہ وبچہ کی صحت یابی، عمر درازی، بچے کے روشن مستقبل اور بچے سے توقعات کے دعائیہ کلمات شامل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ خداوند کریم کے شان کے بیان کے لئے سپت کہے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ سپت بلوچ معاشرے میں جدوجہد کے سرخیلوں اور حق کردار کے مالک افراد اور سیاسی، سماجی اور قبائلی واقعات کو تعریفی کلمات کے ذریعے ان کے مثبت کردار کو بھی بیان کرتا ہے۔

سپت کے معنی ہیں تعریف۔ اصل میں عربی لفظ صفت ہے لیکن بلوچی ادب میں سپت ان اشعار کو کہا جاتا ہے جو عورتیں زچگی کے ایام میں راتوں کو کہتی ہیں۔ سپت کی محفل بلوچ معاشرے میں رسم کی شکل اختیار کر چکی ہے۔۔۔۔۔۔۔ان اشعار میں اللہ، رسول، پیر، اولیا اکرام اور بزرگان دین کی تعریف، قدرت و کائنات کی خوبصورتی، دین کے بارے میں پند و نصائح کے ساتھ ساتھ زچہ وبچہ کی تندرستی و سلامتی کے بارے میں دعا اور نیک خواہشات کا اظہار ہوتا ہے(1)۔

سپت کو خواتین کی پیدائش کے بعد زچہ وبچہ کی خیر و عافیت کے لئے کہتے گاتے ہیں۔ یہ بات واضح کرتا ہوں کہ زچہ وبچہ کے لئے "سپت "گلکناب بلوچ معاشرے میں ایک رسم کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اس کے علاوہ لوریوں کے شب بیداری اور چوگان کو بھی سپت کہا جاتا ہے(2)۔

یہ صنف چونکہ روحانیت اور مذہب سے قربت رکھتی ہے۔ اس لئے ہر اس تقریب کے وقت یا تکلیف کے مرحلے میں جب انسان مذہب کے نزدیک ہو کر دعا کے لئے رجوع کرتا ہے تو اس صنف سے کام لیتا ہے۔ جیسا کہ بیٹوں کے سنت (ختنہ)، حالتِ نزع، کبھی کبھار نکاح اور کبھی کبھار ماں جب بچوں کے ساتھ قول و اقرار کرے تو بھی کہا جاتا ہے۔ جدید دور کے تقاضوں کے مطابق کہیں کہیں برقی آلات سے مدد لی جانے لگی ہے(3)

صلات بلوچ معاشرے کا حصہ ہے۔ بچے کی پیدائش، بچے کی سنت (ختنہ)، جدوجہد کے سرخیلوں اور حق کردار کے مالک افراد اور سیاسی، سماجی اور قبائلی واقعات کے پس منظر، حالت نزع کی سختیوں سے آسانی، چوگان کے ذریعے عبادت یعنی مشکل اوقات اور ہر اس گھڑی میں جب انسان مذہبی طور پر باری تعالیٰ سے رجوع کرتا ہے تو صلت کا سہارا لیتا ہے۔

حوالہ جات:

1۔ اسفر محرم و دیگر۔ 2012۔ آدینک گچین بنک۔ بلوچستان اکیڈمی تربت۔ ص۔ 16

2۔ لقمیر شاد۔ 2016۔ زریں۔ فاضل ولی دیوان، صحبہ۔ ص۔ 12

3۔ ڈاکٹر فضل خالق۔ 2021۔ الس درد۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ ص۔ 162

دستانغ

دستانغ شعری انداز میں سازوں کے ذریعے بیانیہ کہانی کو کہا جاتا ہے، لوک ادب کی یہ صنف مشرقی بلوچستان میں کوہ سلیمان کے حدود میں آباد بلوچ و دیگر پڑوسی قبائل میں یکساں طور پر مقبول ہے۔ نڑ و سُر کی خوبصورت مدھر آواز ہو یا سروز اور دمبورہ کے دلکش تاروں کے لے میں جب بھی کوئی محفل سجتی ہے تو دستانغ خود بخود رواں ہو جاتی ہے۔ اس میں قدیم تاریخ، قبائلی جنگوں اور معرکہ آرائیوں کے احوال، جواں مردی اور بزدلی کے قصے، عشقیہ داستانیں، سرگزشتیں، محبوب کی خوبیاں اور بے وفائیاں وغیرہ سب شعری انداز میں گا کر بیان کی جاتی ہیں، اس میں جواں مردی، شمشیر زنی، گھڑ سواری، بہادری، ہمت، قوت، مہمان نوازی، اور بلوچی ضابطہ اخلاق کا درس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہوتا ہے، یہ ان علاقوں میں آباد اقوام میں اپنی تاریخ سے آشنائی اور رغبت کا سب سے آسان ذریعہ کہلاتا ہے۔

زندگی کے تمام موضوعات کو اپنے اندر سمونے والی اس صنف کو میں دستانگ لکھ رہا ہوں اسے لوگ دستانغ اور دستانہ بھی کہتے ہیں۔ یہ بلوچوں کے مری، بگٹی، بزدار، لغاری، دریشک، مزاری، قیصرانی، گورچانی، بزدار، کھوسہ اور علاقے میں آباد دیگر قبائل میں مشہور ہے اور یہ قبائل اس کے دلدادہ ہیں۔ ہر قسم کی تقریب کو دلکش بنانے کے لئے اس صنف کا سہارا لیا جاتا ہے (1)۔

مشرقی بلوچستان میں مقبول ترین صنف عموماً "دستانغ" والی شاعری ہوتی ہے۔ جس میں ایک شعر کے چار چار، پانچ پانچ مصرعے ہوتے ہیں۔ اس کے موضوعات میں دین، تصوف، اخلاقیات، ادب، عشق، رزم بزم اور توصیف سب آتے ہیں۔ دستانغ جنگی بھی ہو سکتی ہے۔ جس میں کسی دوسرے قبیلے کے ساتھ یا پھر قبیلے کے اندر کسی لڑائی کا قصہ ہوتا ہے۔ ہنگامہ خیز واقعات کا ذکر ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ بلوچ اس صنف کے عاشق ہیں جہاں دو یا زیادہ آدمی ملے داستان گوئی

اور داستان سازی شروع(2)۔

موجودہ دور کے نامی شعرا کرام اور گمنام شاعروں کے موتی جیسے الفاظوں پر مبنی یہ صنف شہ، وجیر اور بین کے ساتھ گایا جاتا ہے۔ یہ قبائل میں بہت مقبول ہے یہ صنف قبائلی زندگی کی بہترین عکاس ہوتی ہے۔ قبائلی معاشرہ جہاں وفا اور جفا دونوں بڑے انتہائی درجے کے ہوتے ہیں اور جہاں مہر و محبت انتہا درجے کی ہوتی ہے۔ محققین مشہور داستانوں کے نام کے بارے میں یوں کہتے ہیں کہ اکثر داستانوں کے شاعر نامعلوم ہیں اور ہمارے بڑے بوڑھے ان شاعروں کے نام والے میرے سوال پر ایک ہی جواب دیتے ہیں (دادا پاپی دہتا ہیا ہے) (یعنی اجداد کے وقتوں کا ہے) ششتیک، ہانلنز (کہتے ہیں کہ زامری جالیانی اس کا شاعر تھا۔ حیف، سوزاں پری یا گو جنگ (شاعر علی شیر رامکانی) چلی بانک (میر خان بیر دارانی) سیاہ تالی ٹھمہ، دادھری، پٹرک، قیس، جھرا، جاڑہ، شیر ہد، جہکلو، لشگ، دیریاں، سمو، تنی، سومری، یاغی، جھمی، اللہ بیلاری، چیڑ ول، سور، بوجلائیں مرگ، مزائیں مرگ (شاعر طوسید یانی بگٹی) قادر (شاعر جمشید رامکانی) سیاہین رحمیر، بورانی شیر وہ وغیرہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ غوث بخش صابر نے اپنے کتاب "ڈیہی ودستانغ" میں درج ذیل دستانغ تحریر کئے ہیں، جن میں، جھمی، گھتو، بگو جنگ، البو بیلٹری، پھرک، شیشک، گھطری، قادر مری، ریشم و پھوک، چیڑ ول، موکلانی، حیف، بارگ، گودو مرگ، بیورغ مزئیں مرگ، مینرہ ڈمری مرو، اڑ جنگ، لڑنگ، دیو جلو، بیرک، جھتوے، باری آئی جاڑ، دیمنڈ، بیرانی، ریل کار، کسائیں مرگ، جھمکو ہانلنز، دھاوری لیوہ، شاوہ پری، شہ تارڈی، گنجان، جنگ، الہ بیلٹری، شیر محمد، تولان، سوزری، زامر، جاپانی، آلیانی، لعنرچوٹی، ماوہ پری، لوڈ کنرغ، بیلی، کھلنٹری پوٹز نامی دستانغ شامل ہیں(3)۔

حوالہ جات:

1۔ڈاکٹر فضل خالق۔2021۔اُس ور۔ بلوچی اکیڈیمی کوئٹہ۔ ص۔215

2۔ڈاکٹر شاہ محمد مری۔2009۔ مختصر تاریخ زبان و ادب بلوچی، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد۔ ص۔55

3۔ غوث بخش صابر۔1971۔ڈیہی ودستانغ۔ بلوچی اکیڈیمی کوئٹہ

لیلڑی

لیلڑی مشرقی بلوچستان کے بلوچوں کا ایک اور بے حد مقبول و معروف لوک گیت ہے، تاہم یہ دیگر علاقوں میں بھی سنا اور پسند کی جاتا ہے۔ گیت میں لیلڑی کی بار ہا تکرار اسے لیلڑی کے نام سے مشہور کرتی ہے۔ اسے نوجوانوں، بوڑھوں، مرد اور خواتین سب میں یکساں پسند کیا جاتا ہے۔

صوت کی طرح لیلڑی بھی بلوچستان کا بے حد مقبول گیت ہے۔ لیلڑی کا قسیہ پورے گیت میں لیلڑی کی تکرار ہے۔ لیلڑی کے ایک ایک مصرع کا الگ الگ مطلب تو نکل سکتا ہے لیکن جب پوار شعر پڑھا جاتا ہے تو وہ معنوی طور پر غیر مربوط ہو جاتا ہے اور یہی لیلڑی کی خصوصیت ہے(1)۔

لیلڑی بہت ہی مقبول صنف ہے۔ اسے موسیقی میں بھی گایا جاتا ہے۔ اس صنف میں لفظ لیلڑی بہت تکرار سے گایا جاتا ہے۔ یہ گانے میں بہت تیز صنف ہوتی ہے۔ اس کے ہر مصرعے کا مطلب جدا ہوتا ہے۔ مگر وزن برابر ہوتے ہیں۔ یہ مہر و محبت کا ترجمان ہوتی ہے(2)۔

بعض ادیبوں کا کہنا ہے کہ یہ لوک گیت مشرقی بلوچستان میں زیادہ مقبول ہے۔ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا بلکہ یہ مغربی اور دیگر علاقوں میں بھی گایا جاتا ہے۔ لیلڑی میں مختلف موضوعات ہوتے ہیں۔ بچے سے لے کر جوان، معشوق، شہر، گاؤں، پہاڑ، ندی، نالے، بیاباں، جانور، چرند پرند سب کو ان اشعار کا موضوع بنایا جاتا ہے۔ مختصر بحروں میں گایا جانے والا یہ لوک گیت عوام میں بہت مقبول ہے۔(3)۔

حوالہ جات:

1۔ عطا شاد/ تین سلام۔ 2001۔ درین۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ ص۔ 199

2۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری۔ 2009۔ مختصر تاریخ زبان و ادب: بلوچی۔ مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد۔
ص۔50
3۔ انور نسیم مینگل۔ سدرچ 2016۔ بلوچی لوک ادب، ابتک گنگت، گنگت اکیڈمی آف سائنسز، کوئٹہ

2۔ڈاکٹر شاہ محمد مری۔ 2009۔ مختصر تاریخ زبان و ادب: بلوچی۔ مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد۔
ص۔50

3۔انور نسیم مینگل۔سدرۃ 2016۔ بلوچی لوک ادب، ماہتاک سنگت، سنگت اکیڈمی آف سائنسز، کوئٹہ

گیت

صوت، سوت یعنی گیت بلوچی ادب کی ایک مشہور صنف ہے جس میں گیت کے معنی اور اس کی نوعیت کسی بھی کی ہو اس کے اظہار میں ایک سادگی اور ایک سلاست کو ملحوظ رکھا جاتا ہے اور اظہار کے لئے صرف محسوسات پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ تخیلات کے بلند محلات تعمیر نہیں کئے جاتے اور نہ ہی معنی یا تحریری مندرجات کا سہارا لیا جاتا ہے۔ گیت میں کسی بیت، مصرع یا مصرعے کے کسی جزو کی تکرار سے کام لیا جاتا ہے۔

صوت ایک صنف ہے جو بچوں کے گیت، دولہے کی گیت، دولہن کے گیت وغیرہ کے شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ جیسا کہ ہر صنف نے وقت اور حالات کے مطابق تبدیلی کے مراحل طے کئے ہیں۔ اسی طرح گیت بھی ابتدائی طور پر مردوں نے گیے۔ بعد میں تبدیلیوں کے مراحل کے بعد خواتین بھی اس کا حصہ بنیں۔ شروع میں ان کے موضوعات میں شادی اور خوشی کے مواقع ہی رہے بعد میں سیاسی و دیگر موضوعات اس کا حصہ بنے(1)۔

سوت بلوچی ادب میں دیگر اصناف کی طرح ایک صنف ہے۔ دستیاب گیتوں کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اس صنف کی شاعری میں بے پایاں وسعت سموئی ہوئی ہے۔ جیسا کہ اس کے اندر زندگی اور معاشرے کے مختلف النوع جوش وجذبے، بات چیت، خیالات، دلی خواہشات وجذبات کے پہلو دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح اس میں خوشی وشادمانی، مہر ومحبت، غصہ وناراضگی، دوری وجدائی، طنز ومزاح، وفاو بے وفائی جیسے جوش وجذبہ عیاں ہوتے ہیں(2)۔

بلوچی لوک گیتوں کی مقبول ترین صنف "سوت" بلوچستان کے تقریباً سبھی علاقوں میں رائج ہے۔ اس صنف سے متعلقہ گیتوں کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ شادی بیاہ اور دیگر پُر مسرت

تقاریب میں گائے جاتے ہیں۔ ان گیتوں میں مسرت و بہجت کے علاوہ گاہے گاہے ہجر و فراق اور رنج و غم کے قصے بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ مشترکہ جذبات و احساسات کا پر خلوص اظہار اس صنف کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کی بڑی وجہ ہے۔ سوت میں مرد اور عورت ناچ اور تالیوں کے ساتھ حصہ لیتے ہیں(3)۔

جدید اصناف میں صنف گیت کا بھی اضافہ ہوا ہے، اگرچہ سوت خود بلوچی کی ایک پرانی چیز ہے لیکن جدید طرز کے گیت اور اس سوت میں بہت فرق ہے یعنی ہندی اور اردو گیتوں کی طرح بلوچی میں بھی مخصوص گیت کہے گئے ہیں(4)۔

حوالہ جات:

1۔ ڈاکٹر فضل خالق۔ 2021۔ اسں در۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ ص۔ 221
2۔ فقیر شاد۔ 2016۔ ذرنج۔ فاضل ادبی دیوان، سندھ۔ ص۔ 104
3۔ عطا شاد، مبین سلام۔ 2001۔ درپن۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ ص۔ 13
4۔ سید ظہور شاہ ہاشمی۔ 1986۔ بلوچی زبان و ادب۔ ایک جائزہ۔ سید ہاشمی اکیڈمی، گوادر۔ ص۔ 138

لوری

لولی(لوری)ایک لوک گیت ہے جسے مائیں بچوں کو نیند کی آغوش میں لے جانے کے لئے گاتی ہیں۔ لوری گانے والی عورت بچوں کو گود میں لٹا کر یا جھولے میں ڈال کر یا گلے لگا کر تھپکتی ہے یا سے بازو میں لے کر جھلاتی ہے اور ساتھ ساتھ لوری کے مصرعے گنگناتی ہے۔ اکثر لوریاں ماں کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں لیکن بعض لوریاں بڑی بہن جذبات واحساسات کی ترجمان بھی دکھائی دیتی ہیں۔ لوری کا مواد بچے کے درخشاں مستقبل کے توقعات، اس کی کامیاب زندگی کے لئے دعاؤں ودیگر متعلقین کی تعریف وتحسین پر مشتمل ہوتا ہے۔ جذبات، معصومیت، سادگی، بے ساختگی، شیرینی، دلکش، مقامی رنگ اور گہرا معاشرتی نقوش عام لوک گیتوں کی طرح لوریوں کی بھی نمایاں خصوصیات ہیں۔

لوری میں بچے کی تندرستی، درازی عمر کی دعا کے ساتھ ساتھ بہادری، تیغ زنی، سخاوت، غیرت اور بچی کے لئے ننگ وناموس، غیرت وحمیت کی پند ونصائح موجود ہوتے ہیں۔ لولی عورت کی شاعری ہے۔ لولی کی زبان میٹھی، سادہ وسلیس ہوتا ہے۔ لولی میں قومی زندگی اور رسم ورواج کو بھی عیاں کیا جاتا ہے۔ اس میں ماں اپنے بچوں کو محبت، دوستی واخلاص کا درس بھی دیتی ہے(1)۔

بلوچی کی ابتدائی شاعری "لولی"(لوری) اور ہالو ہے جہاں تک لولی کا تعلق ہے یہ وہ سبق ہے جو چاند سے چہرے والے لڑکے اور دراز زلفوں والی لڑکیاں ماؤں کی پیار بھری گود میں آدھی راتوں کو سن کر شیر خوری سے لے کر سات سال کی عمر تک پہنچے ہیں۔ ان لوریوں میں نہ صرف ماں کی ممتا ہوتی ہے بلکہ اپنے دودھ پیتے بچوں کو ان کے ذریعے بلوچ معاشرے کے ماضی، حال اور مستقبل کا درس بھی دیتی ہے۔ ان اندھیروں میں بلوچ ماں کی لوری ہوا کے جھونکے کے ساتھ جھولے میں ماضی اور حال کے آنے والی داستانیں بھی ہیں(2)۔

شاید قدیم ترین شاعری بھی ماں کی ہوتی تھی، اس لیے اسے اچھی طرح یاد رکھا گیا۔ ماں لوری ہے، لوری ماں ہے اور لوری کو بلوچی میں "لولی" کہتے ہیں۔ ماں پنگھوڑے میں سوئے ہوئے اپنے بچے یا بچی کے لیے گاتی ہے۔ بچہ جو رات کو سونے نہیں دیتا، ماں گاتی بھی اسی وقت ہے۔ جب ساری دنیا سوئی ہوتی ہے۔ لہٰذا تخلیق کے لئے مکمل تنہائی، مکمل سکوت ہوتا ہے(3)۔

ماں لوری گاتی جاتی اور نئی لوری بناتی جاتی ہے دل کے ارمان اپنی سماجی، مادی، معاشی حالت، بچے کے لئے خواہشات کی تفصیل، اس کے لئے دعائیں۔۔۔۔ غرض ایک بھرپور شاعری ہوا کرتی ہے۔ طرز تو تقریباً ایک ہی رہی مگر اس کے بول، مصرعے اور خیالات وسعت پاتے رہے، ماں پنگھوڑے کے قریب گا گا کر بچے کو جھلاتی رہتی ہے، ماں لوری بن جاتی ہے اسی آواز میں تو ماں کے دل کی آواز ہوتی ہے۔ ماں جس کا کوئی نعم البدل نہیں جو ایک بار ہی ملتی ہے۔ اکیلی ہی ملتی ہے اس کی ہمسری کرنے والا پورے لولاک میں کوئی نہیں ہوتا (4)۔

لولی کی زبان بہت سادہ اور شیریں ہوتی ہے۔ اس میں قبائلی سماج کے مظاہر مثلاً غیرت، بہادری اور جنگ وغیرہ کی بڑی تکرار ہوتی ہے۔ مائیں اپنے شیر خوار بچوں کو خودداری، خود اعتمادی اور ننگ اور غیرت کا سبق دیتی رہتی ہیں۔ یہ گیت بچوں کو سلاتے وقت سنائے جاتے ہیں۔ گو کہ مائیں بچے اور بچی دونوں کو لولی سناتی ہے مگر حتمی طور پر دکھ درد میں اس کا نجات دہندہ تو بیٹا یا بھائی ہوتا ہے اس لئے وہ سارے ارمان بیٹے کے لئے کرتی ہے اور اپنے سارے دکھ اور آپ بیتی اسی لوری میں بیان کرتی ہے دنیا کی کوئی بھی زبان اتنی مفلس اور قلاش نہ ہوگی جس میں لولی موجود نہ ہو۔ دنیا میں ہر جگہ ہمدرد اور مہر کا سمندر یعنی ماں موجود ہے اور جہاں ماں، وہاں بچے کے لیے اس کا احساس محبت بھی موجود ہوتا ہے۔ ہر ماں چاہتی ہے کہ اس کا بیٹا لڑائیوں میں بڑے بڑے سورماؤں کا مقابلہ کرنے میدان میں اترے، وہ نیک ہو اور بات کا پکا ہو(5)۔

وہ یہ ساری دعا یہ ساری باتیں بہت آرام دہ اور ہلکے جھولوں کے دوران میٹھی اور نرم آواز سے اسے بتاتی جاتی ہے۔ گو کہ لولی مخطوں، دیوان کی صنف نہیں مگر بلوچی ادب میں کئی دوردا کی داستان میں لولی کے بلند و ارفع نمونے ملتے ہیں۔ بلوچی لولی میں عموماً بہادرانہ اور شجاعانہ جذبات کا اظہار ہوتا ہے ایک لولی میں ماں اپنے بچے سے مخاطب ہے:۔

تو جلدی بڑا ہو کر تلوار اٹھا لے۔
دل کو سنبھالے، میں اس کی منتظر ہوں
(جب تو) باپ کے خون کا بدلہ حریفوں سے لے گا۔

اس سے بلوچ ماں کی تربیت کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ تلوار کا دھنی بنے اور خون کا بدلہ لے اور بلوچوں کی فطرت اور مزاج کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بلوچ ماں اپنے بیٹے کی بہادری پر ہی خوش ہوتی ہے (6)۔

جیسا کہ زمانہ تبدیل ہو رہا ہے۔ اسی طرح انسان کی زندگی گزارنے کے طور اور اطوار بھی تبدیل ہو رہے ہیں۔ بلوچ خانہ بدوشانہ اور مویشی پالنے جیسے زندگی سے نکل کر شہری زندگی اپنا رہے ہیں تو اس کی زندگی کی ضروریات بھی تبدیل ہو رہی ہیں۔ وہ لوگ نئی زندگی نئی دنیا یا نئی اشیا کی جانب راغب ہو رہے ہیں۔ بھیڑ بکریاں پالنے کے بجائے نئے کام، ہنر، ٹیکنالوجی اور حصول علم جیسے ضروریات کے طلب گار ہو رہے ہیں (7)۔

یوں جدید دور کے ضروریات نے لوری کے موضوعات کو نیا رخ دیا۔ اب ماں بچے کے لیے حصول تعلیم، جدید ٹیکنالوجی کے میدان میں کارنامہ سرانجام دینے اور جدید دنیا کے ہم پلہ ہو کر مختلف میدان میں جوہر دکھانے کی باتیں کرتی بھی نظر آتی ہیں۔

حوالہ جات:

1۔ اصغر کریم، غیرہ۔ 2012۔ آریک گچین ءِ کتاب۔ بلوچستان اکیڈمی تربت۔ ص۔ 21
2۔ میر شیر محمد مری۔ 2007۔ (اشاعت دوئم)۔ بلوچی زبان و ادب کی تاریخ۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ ص۔ 51
3۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری 2009۔---------- ص۔ 213
4۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری 2010۔---------- ص۔ 213
5۔ عبدالمجید ہمین۔ 1971۔---------- ص۔ 370
6۔ عطا شاد۔ سہمیں سلام۔ 2001۔ دزین۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ ص۔ 63
7۔ فقیر شاد۔ 2016۔ ارزنگ۔ فاضل ادبی دیوان مند۔ ص۔ 47

ہالو

ہالو بلوچی لوک ادب کی قدیم صنف ہے جو کہ مسرت اور شادمانیوں کے دوران ایک مخصوص وقت پر گایا یا کہا جاتا ہے۔ اس دوران گھر اور عزیز و اقارب کی بزرگ خواتین دلہا اور دلہن کو تیار کرنے کے وقت ان کی بلائیں اپنے سر لینے کا عمل دہراتی ہوئے اسے گاتی ہیں۔ ہالو بلوچی لوک شاعری کے دیگر اصناف کی طرح ایک خوبصورت صنف ہے۔ یہ خوشی کا گیت ہے جو زیادہ تر شادی، منگنی، و دیگر خوشی کی تقریبات میں کہی جاتی ہے۔

شادی کے وقت جب دلہن کو شادی کا جوڑا پہنانے، سجانے اور مہندی لگانے کے رسم ہو یا پھر دولہے کو نکاح سے قبل نہلا دھلا کر تیار کرنے کا مرحلہ ہو یا دلہن کو حجلہ عروسی کی جانب لے جانے کی رسم ہو اس دوران ہالو کہا جاتا ہے۔ ہالو رباب، سریندہ، دیرہ، تمبورہ اور دمبورہ جیسے سازوں کے ساتھ کہا جاتا ہے۔ لیکن جب ساز دستیاب نہ ہوں تو اس کے بغیر بھی کہا جاتا ہے(1)۔

ہالو وہ شعری صنف ہے۔ جو شادی بیاہ کے موقع پر عورتیں گاتی ہیں ہم اس "ہالوئی ادب" کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ہالو، نازینک، لاڑو، ان اصناف کا تعلق قدیم ترین ادب سے ہے۔ ہالو خود اپنے دور اور وقت کے مطابق حالات و واقعات کا تذکرہ کرتا ہے(2)۔

شادی بیاہ کے موقعوں پر گائے جانے والا یہ گیت بھی سوت ہی کی ایک قسم ہے۔ لاڑو کے برعکس ہالو بلوچی مسلسل تکرار اس کی خصوصیت ہے۔ یہ گیت دولہا و دلہن کی تعریف و توصیف میں اس وقت چھیڑتے ہیں۔ جب دلہن کلہ (حجلہ عروسی) اور دولہا کو کورگ (وہ خاص جگہ جہاں دولہا کو لے جا کر نیا جوڑا پہنایا جاتا ہے اور جہاں نشانہ بازی اور تیغ آزمائی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے) سجایا جاتا ہے۔ ہالو کا رواج مغربی اور مشرقی بلوچستان میں عام ہے(3)۔

بلوبالو کی شاعر بھی عورتیں ہیں اور گانے والی بھی۔ یہ خوشی و خوشحالی کی رواں ندی کی طرح ہوتی ہے جو شادی و شادمانی کے مواقع پر گائی جاتی ہے۔ اس کو گانے کے لئے کورس کا انداز ہوتا ہے۔ ایک یا دو عورتیں مصرعے بولتی ہیں اور باقی عورتیں مل کر کہتی ہیں "اے بلو بالو، بالوائے "بالو کی اس بار بار تکرار کی وجہ سے اسے بالو نام دیا گیا ہے۔

بالو میں دلہن کی خوبصورتی، شگھڑپن اور دوسری اوصاف کی تعریف بھی ہوتی ہے اور دولہا کی صحت مندی، بہادری، نشانہ بازی، گھڑ سواری و دیگر مردانہ صفات کی توصیف بھی۔ بالو میں دلہا دلہن کی آئندہ زندگی کے لئے خواہشات اور دعائیں بھی ہوتی ہیں(4)۔

یہ رقص کے زیر و بم کے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ یہ صنف صدیوں سے جاری و ساری ہے۔ اس کی نہ کوئی خاص شاعرہ ہے نہ کوئی مالکن ہے بلکہ پورا معاشرہ اس کا محافظ ہے۔ ساری عورت نسل اس کی شاعرہ اور اس کی پالن ہار ہوتی ہے۔ ترنم اور نغمگیہ صنف کی اس شاعری میں وزن برابر ہے۔ باقی شعری لوازمات کا کوئی خیال رکھا نہیں جاتا(5)۔

بالو کے دوران گھر کی بزرگ عورتیں مل کر دولہے کی بلائیں اور مشکلیں اپنے سر لینے کی رسم بھی کرتے ہیں، دعائیہ کلمات دولہے کے لئے کہتے ہیں، جس کو "بلہائی زیرگ" یعنی بلائیں اپنے سر لینا کہتے ہیں۔ اس عمل کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دلہا نئی زندگی کا آغاز کر رہا ہے، تو بزرگ خواتین ان کے مشکلات، آفات اور تکالیف اپنے سر لے کر اس کے خوشحال زندگی کو آسان بناتے ہیں تاکہ شادی کے بعد وہ خوش و خرم زندگی گزار سکے۔

حوالہ جات:

1۔ اصغر محرم و غیرہ۔2012۔ آو یک گچین تاک۔ بلوچستان اکیڈمی تربت۔ ص۔26
2۔ میر شیر محمد۔2007(شاعت دوئم)۔ بلوچی زبان و ادب کی تاریخ۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ ص۔ 53
3۔ عطا شاد۔ عین سلام۔ 2001۔ دریں۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ ص۔63
4۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری 2010۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص۔213
5۔ عطا شاد۔ عین سلام۔ 2001۔ دریں۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ ص۔ 71-65

نازینک

نازینک یا نازینگ کا مطلب ہے تعریفی گیت جو اکثر خوشی کے مواقع، بچے کی پیدائش، بچے کی پیدائش کے چھٹے دن نام رکھنے کی تقریب "شششگان"، سنت (ختنہ) کی تقریب "'چھل بزی"، شادی، منگنی کے مواقع پر گایا جاتا ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ نعت منقبت یا قصیدہ گوئی کو بھی نازینگ کہا جاتا ہے۔

نازینک لوک شاعری کی خوبصورت صنف ہے۔ کہتے ہیں نازینک، نازینگ سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں تعریف کرنا۔ تاہم نازینک و نازینگ الگ الگ معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ نازینک کے معنی تعریف اور نازینگ کے معنی تعریف کرنا ہے۔ نازینک ان اشعار کو کہا جاتا ہے جو دلہا دلہن اور ان اشخاص کے لئے کہا جاتا ہے جنہوں نے زندگی میں اچھا کام کیا ہو یا کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہو۔ اس لئے ان کی تعریف کی جاتی ہے۔ اس میں ماؤں نے اپنے بہادر بیٹوں اور بہنوں نے جیالے بھائیوں کی تعریف کی ہے (1)۔

ہم نازینک کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا وہ جو مائیں الفتِ مادری میں اپنے نونہال کے سلانے کے لئے الہان کرتی ہے جسے لوری بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے دوسرے حصے میں نازپرورد وہ بہنیں اپنے بانکے بھائیوں، دوشیزائیں اپنے خاوند، شادی و خوشی کی تقریب میں عزیز و اقارب دلہے و دلہن کی تعریف کرتے ہیں۔ اس میں لاڑو اور ہالو کے حصے بھی آتے ہیں۔ نازینک بھی لولی، ہالو اور لاڑو کی طرح کا گیت ہے کہ جس میں بہن اپنے بھائیوں، بیوی اپنے شوہر کے علاوہ سواری و دیگر چیزوں کے تعریف میں کہتی ہے (2)۔

نازینک، ہر اس منظوم اور ترنم کے ساتھ گانے کو کہتے ہیں جو کسی کی تعریف، نعت اور ستائش کے بارے میں ہو مثلاً نعت، منقبت یا قصے کو نازینگ کہتے ہیں۔۔۔ نازینک اس نظم

کو بھی کہتے ہیں جو دولہا یا دلہن کی وصف و ثنا میں کہی جائے، یہ ان گھریلو شادی بیاہ کے گیتوں کی فہرست میں آتا ہے جو روایتی طور پر کسی قوم میں باقی رہی ہوں (3)۔

نازینک وہ گیت ہے جو شادی یا منگنی کے موقع پر بہن گاتی ہے۔ اس میں وہ اپنے بھائی کے حسن و جمال کی تعریف بھی کرتی ہے تو بہادری کے گن بھی گاتی ہے۔ دلہن کی سہیلیاں نازینک میں دولہا کی کمزوریوں کا ذکر کر کے اس کی خوب درگت بناتی ہیں۔ یہ گیت صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہیں جو دوسری خوشی کے مواقع پر بھی گاتے ہیں (4)۔

نازینک میں ماں نہ صرف اپنے بچوں کی تیغ زنی، دلیری اور بہادری کی تعریف کرتی ہے بلکہ اس کے علاوہ اس کے دیگر اچھے عادات و کارناموں کا اظہار کرتی نظر آتی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ آج کے دور میں تیغ زنی کا دور ختم ہو چکا ہے۔ تلوار اور ڈھال ہاتھ میں لینے کے بجائے قلم اور کتاب کا دور دورہ ہے۔ تو ماں بھی اپنے بچے کو پڑھنے کے عمل، کاغذ، قلم، کتاب سے نزدیکی کے عمل کی تعریف کرتی ہوئی نظر آتی ہے (5)۔

مبارک قاضی نے اپنے بیٹے کے مستقبل پر ایک نازینک لکھا ہے۔ اس کے علاوہ متعدد شعراء نے نازینک کے ذریعے اپنے اپنے پیاروں کی تعریف کر کے ان کے کردار کو نمایاں کیا ہے۔

حوالہ جات:

1۔ اصغر محرم و غیرہ۔ 2012۔ آزینک گچین تاک۔ بلوچستان اکیڈمی تربت۔ ص۔ 21
2۔ ڈاکٹر فضل خالق۔ 2021۔ اُلس ورد۔ براہوئی اکیڈمی کوئٹہ۔ ص۔ 183
3۔ سید ظہور شاہ ہاشمی۔ 1986۔ بلوچی زبان و ادب۔ ایک جائزہ۔ سید ہاشمی اکیڈمی، گوادر۔ ص۔ 119-120
4۔ عبدالمجید میمن۔ 1971۔ مختصر تاریخ...... پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ ص۔ 371
5۔ تخیر شاہ۔ 2016۔ ارتقا۔ فاضل اوبی کاروان، مند۔ ص۔ 140-141

لاڑو

لاڑو، لئی لڑو، لاڑوک، لاڑوگ بھی شادی و خوشی کے موقع پر گاتے ہیں۔ ہالو کی طرح ان گیتوں میں لڑے، لاڑے، لاڑ، لاڑو وغیرہ الفاظ کی تکرار رہتی ہے۔ اس لیے اس صنف کا نام لاڑو، لئی لڑو یا لاڑوک پڑ گیا۔ یہ لوک شاعری کی ایک صنف ہے جن کی شاعرائیں عورتیں ہوتی ہیں۔ وہی اسے تخلیق کرتی ہیں اور وہی اسے گاتی ہیں۔ یہ بہت ہی پر تفریح صنف ہے جس کو کہیں بھی، کسی بھی اچھے موقع پر گایا جاسکتا ہے شادی بیاہ میں، جشن میں، آغہ میں۔ جب ہم شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس میں وصال کے لئے فریاد بھی ملتی ہے۔

پہلے زمانے میں دلہے کے گھر کی خواتین سات دنوں تک لوک کہانیوں کے اشعار کہا کرتی تھیں۔ زیادہ تر اشعار حانی و شہ مرید، کیا و صدو وغیرہ کی ہوتے تھے۔ ایک عورت آغاز کرتی اور تین خواتین اسے آگے لے جاتے۔ لاڑو وہ گیت ہے جو شادی اور خوشی کے مواقع پر جواب کے طور پر الہان کیا جاتا ہے۔ اس میں "لیلا لاڑو لاڑو لیلا لاڑو لاڑو" ہر بار دہرایا جاتا ہے۔ اس دوران رقص بھی کیا جاتا ہے(1)۔

لئی لڑو، لولی، ذہیری عجیب اصناف۔ جو بہ یک وقت محبوب کے لئے بھی استعمال ہوتی ہیں۔ بیٹے اور بھائی کے لئے بھی۔ خیلوا کی تروون، افغان ریسرچ میگزین اس کے بارے میں ایک اور روایت بیان کرتا ہے۔ "لئی لڑو بہت تاریخی اہمیت رکھتی ہے جس کے اندر عشق، گیت اور تلوار کا ذکر ہے۔ جس دور میں بلوچوں کے اندر قبیلوں کی دشمنی عام تھی اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے خلاف اعلان جنگ کرتا، تو جب دونوں طرف کے تلوار باز میدان میں اترتے ہیں۔ بلوچ دوشیزائیں انہیں جنگ پہ اکسانے اور ان کی ہمت بڑھانے کے لئے مل کر ایسے گیت گاتیں جس سے نوجوان بہادری سے لڑتے۔ عورتوں کے اس گیت نے بہت سی عورتیں کو بیوہ بنایا"(2)۔

زہیروک

زہیروک لفظ "زہیر" یعنی "یاد" سے نکلا ہے۔ زہیروک مطلب کسی یاد کی کیفیت کو بیان کرنے کا لوک گیت۔ زہیروک کو بلوچی زبان کے لہجوں کے مطابق مختلف علاقوں میں زئیروک، زہیریگ، زہیرگ، زہیرونک بھی کہا جاتا ہے۔ زہیروک لوک شاعری کے دیگر اصناف سے توانا صنف ہے۔ اس لیے گیتوں کی اس صنف میں عام طور پر انتظار، ہجر وفراق وغیرہ کے مضامین کا بیان موجود ہوتا ہے۔ ویسے زہیروک شاعری کے ساتھ ساتھ بلوچی راگ بھی ہے۔

ضروری نہیں کہ زہیروک صرف محبوبہ کی جدائی میں کہا جائے بلکہ یہ اس دوست کے لئے بھی کہا جائے جو انتہائی نزدیکی ہو۔ جیسا کہ ماں، بچے، بھائی، دوست، سہیلی اور اس کے علاوہ علاقے اور وطن کے لئے کہا جاتا ہے۔ زہیروک مرد اور خواتین دونوں کہتے ہیں۔ عورتوں کے زہیروک زیادہ پُر اثر اور پُر درد ہوتے ہیں۔ ان میں عورتوں کی خواہشات اور ارمانوں پر زیادہ زور دیا جاتا ہے جبکہ مردوں کے زہیروک ان کی خواہشات کی ترجمانی کرتی ہیں (1)۔

ذاتی جذبات کی گہرائی کے اظہار کے لیے زہیروک سے زیادہ موثر صنف شاید کوئی اور ہو، گھر کی یاد، محبوب، والدین اور خاندان سے جدائی ہی اس کا موضوع ہوتی ہے ـــــ کسی قریب ترین ہستی کو یاد کرنے کی عمیق ترین کیفیت کے شعری اظہار کو زہیروک کہتے ہیں۔ زہیروک بھی لیکو اور ڈیہی کی طرح ہیں۔ یہ سیدھی سیدھی جدائی اور فراق کو چھیڑنے والی صنف ہے۔ کبھی ساز اور کبھی ساز کے بغیر خوش الحان گلے اسے چھیڑتے ہیں (2)۔

زہیروک کو بعض جگہوں پر "چیہال" (چیخ) اور "اہبان" (پکار) بھی کہا جاتا ہے جنہیں پہلوان (لوک فنکار) کہتے ہیں۔ جب لوک فنکار جنگی اشعار یا پیار کی داستان کہتے ہوئے چیہال اور اہبان دیتے ہیں تو انہیں بھی زہیروک کہا جاتا ہے۔ لوک فنکار چیہال یا زہیروک کو "لاڑو"،

"دولو" (راگ) کی طرز سے شروع کرتے ہیں۔ لوک فنکاروں کے ایسے بہت سارے الحان یا زہیروک موجود ہیں جو ایک علاقے میں ایک انداز سے کہا جاتا ہے تو وہ دوسرے علاقے میں دوسرے انداز سے کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ اشرف ہزارہ، میدی، میانگ، جتوزاہی، جنتری، کُر، کُردی، پاہو، زرنگی و دیگر ہیں جن کے بارے نامور لوک فنکار فیض محمد بلوچ کہتے ہیں کہ یہ دو سو سے زائد ہیں(3)۔

پہلوان مزار ابراہیم نے مجھے ایک ملاقات میں بلوچی زہیروک کی جو اقسام بتائی ہیں وہ یوں ہیں۔ 1۔ جتوزاہی، 2۔ قبلی، 3۔ میدی، 4۔ زرنگی، 5۔ رودباری، 6۔ بنگلردی، 7۔ کچی شرنا، 8۔ یک ڈک، 9۔ نیام ہوزہیرگ۔ 10۔ گونگ ہوزہیرگ، 11۔ سلات ہوزہیرگ، 12۔ کُردی، 13۔ شف، 14۔ سان تر، 15۔ گورباہو زہیرگ، 16۔ اشرف ہزارہ(4)۔

زہیروک عام لوک گیتوں سے قدرے مختلف ہے۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے۔ کہ یہ مخصوص غمناک موسیقی کے ساتھ گایا جاتا ہے۔ چونکہ یہ صنف دانستہ تخلیق کی جاتی ہے۔ (مثلاً مبہ ناز اور اشرف دراوغیرہ کے زہیروک) اس لیے بعض لوگ اسے بلوچی شاعری کی مروجہ اصناف ہی میں شمار کرتے ہیں۔ مگر الگ موقع محل کی مناسبت سے یہ لوک گیتوں کے زمرے میں آجاتی ہے۔ زہیروک عام طور پر عورتیں چکی پیستے وقت گاتی ہیں۔ چکی کی آواز بھی اس گیت کی تاثیر میں مدد دیتی ہے۔ مکران کے علاقے کے شتربان اسے سفر کا ساتھی سمجھتے ہیں اور اس گیت کے غمناک آہنگ سے بچھڑے ہوؤں کی یاد تازہ کرتے ہیں(5)۔

حوالہ جات:

1۔ ڈاکٹر فضل خالق۔ 2021۔ اَلس ءِ دروشم۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ ص۔ 198-199

2۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری۔ 2009۔ مختصر تاریخ زبان و ادب بلوچی، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد۔ ص۔ 53

3۔ اصغر مراد و دیگر۔ 2012۔ آزیک گلین تاک۔ بلوچستان اکیڈمی تربت۔ ص۔ 30

4۔ ڈاکٹر فضل خالق۔ 2007۔ شلک ءِ ست ءِ گنج۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ ص۔ 131

5۔ عطا شاد۔ عین سلام۔ 2001۔ درپن۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ ص۔ 91

چوگان

چوگان یا چوغان ذکری فرقے سے تعلق رکھنے والے بلوچوں کا دعائیہ و تعریفی گیت ہے۔ اس میں خداوند تعالیٰ، محمد ﷺ، مذہبی نیکیوں، کوہ مراد اور اس کے قریب واقع قدیم ذکری روحانی اکابرین کی قبروں اور تربت شہر بلوچ بہادری، مہمان نوازی، جنگی کرداروں، تاریخی واقعات کی تعریف و توصیف شامل ہوتی ہے۔ یہ بلوچی لوک صنف "سپت" سے مشابہت رکھتی ہے۔ جس کو ہم اردو میں صفت یعنی تعریفی کلمات یا مدح کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایک رسم بھی کہلاتی ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ دعائیہ کلمات پر مشتمل رسم ہے تو بے جانہ ہوگا۔

ذکری بلوچ ہی وہ بلوچ ہیں جو ثقافت کے دلدادہ ہیں۔ ان کے فرقہ کے سارے ادب، آداب اور رسومات کی ادائیگی عظیم بلوچ غیرت کی چوکھاٹ کے اندر ہوتی ہیں۔ دوسرے فرقوں کے ملا لوگ خواہ جو پروپیگنڈہ چاہے کریں۔ سچ بات یہ ہے کہ ذکری بلوچ یورپی اور امریکی لوگ نہیں۔ یہیں کے بلوچ ہیں اور بلوچوں کے بھاری اور گراں قدر کلچر سے بندھے ہوئے ہیں اور یہ ممکن ہی نہیں کہ بلوچ ثقافت سے ہٹ کر رسومات کر سکیں (1)۔

قبل از سلام تاریخ کے اوراق واضح کرتے ہیں۔ اس خطے میں پر قدیم آباد لوگ رکھنے مل کر عبادت کیا کرتے تھے۔ ممکن ہو کہ یہ عبادت کا طریقہ اس قدیم سلسلے کی کڑی ہو، ان کے گیتوں میں عربی، فارسی اور بلوچی زبان کا مرکب ہوتا ہے۔

حوالہ:

1۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری۔ 2009۔ مختصر تاریخ زبان و ادب بلوچی، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد

مرثیہ

موتک (مرثیہ) ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں شاعر اپنے کسی پیارے کے دنیا سے رخصت ہونے پر اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے اور وہ اپنے اشعار میں مرحوم کی خوبیوں کو بیان کر کے اسے خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔ مرثیہ کے لئے کسی مخصوص ہیئت یا ترتیب قوافی کی کوئی شرط نہیں۔ موتک کو موتیک، مودہ اور مورگ بھی کہا جاتا ہے جس کے بلوچستان کے مختلف علاقوں میں بلوچی زبان کے مختلف لہجوں کی وجہ سے الگ الگ انداز کے ساتھ ملے جلے نام ملتے ہیں ۔ موتک کو ہم اردو میں مرثیہ ہی کہہ سکتے ہیں۔

بلوچی موتک، موتگ، مودو کو اردو میں مرثیہ اور انگریزی میں "Elegy" فارسی میں موبیہ اور عربی میں "رثا" کہتے ہیں۔ یہ تقریباً دنیا کے تمام زبانوں میں ملتا ہے۔ کچھ محققین کہتے ہیں یونانیوں نے اپنے بہادروں کے لئے کہے۔ پھر بعد میں براوننگ، گوئٹے، غالب و دیگر نے اس صنف میں اپنی تخلیقات سامنے لائے(1)۔

موتک اکثر تین روزہ سوگ کے دوران کہے جاتے ہیں۔ جیسا کہ فوتگی کے بعد خواتین بھی تین دن تعزیت کے لئے بیٹھتی ہیں اور موتک کہتی ہیں۔ چھوٹے بچوں یا نوجوانوں، بزرگ، بوڑھوں، نوجوان، گبھرو کے موت کے وقت موتک کہا جاتا ہے۔ ان کا جائزہ لینے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ہر عمر کے فرد کے لئے، اسی طرح مرد و عورت کے لئے بھی الگ الگ مرثیہ کہے جاتے ہیں(2)۔

میر بیورگ اور میر ریحان رند کے مرثیے ان کی قلبی واردات کے حوالے سے ہیں کہ جن کا چاکری عہد کے جنگی پس منظر سے کوئی تعلق نہیں، حقیقت میں یہ دونوں مرثیے سے کہیں زیادہ بابر یہ نیش کوش کے زمرے میں آتے ہیں۔ تاریخ چاکری عہد کے ان دو مرثیہ کے علاوہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی شاعری میں مرثیے ملتے ہیں۔ جن میں ملا بہار اور عومر زئی، میر

جمال خان لغاری کی وفات پر پنجو بگلانی، کیچ کے میر محراب خان گچکی کے بیٹے میر احمد خان کی وفات (1955) پر ملا اسماعیل پل آبادی اور عبدالعزیز کے وفات پر ابراہیم باہوٹ کے مرثیے قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح عزت پنجگوری نے اپنی محبوبہ مہرک پر جو مرثیہ کہا وہ نہایت ہی پاکیزہ اور سچے جذبات کا مظہر ہے اور اس میں کیفیت غم و اندوہ کو بڑی سادگی سے پیش کیا گیا ہے۔ ایرانی بلوچ سردار صیم خان ا شاری پر لکھا مرثیہ جو (1957 میں شہید ہو گئے تھے) کو بھی اپنے اعتبار سے اچھا مرثیہ کہا جا سکتا ہے لیکن سب سے قابل ذکر مرثیہ ایک بلوچ شاعرہ سیمک کا ہے جو انہوں نے اپنے شوہر نتھا کی یاد میں کہا(3)۔

سیمک کی شاعری میں اس پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی کہ اسے قدرت کے ہر منظر میں اپنا بانکا شوہر نظر آتا ہے۔ اس کے دل کو کوہساران کے بلند و بالا پہاڑوں پر چھائے بادل نتھا کے پگڑی کے بل لگتے ہیں، برستی جھڑی اپنے نتھا کے بال اور زلف محسوس ہوتے ہیں۔ بجلی کی چمک نتھا کی آبدار تلوار دکھتی ہے۔ گھن گرج نتھا کے بندوق کی آواز لگتی ہے۔ ہر خوبصورت چیز اسے نتھا کی نشاندہی کرتی دکھائی دیتی ہے(4)۔

بانک شلی اپنے محبوب حسن مولانغ کے موت کے موقع پر اپنی کنیز کو کہتی ہیں بناو سنگھار کے لئے آمیزش مت بنا کیونکہ میں نہ غسل کروں گی اور نہ زلفیں سنواروں گی۔ وہ اپنی کیفیت بیان کرتی ہیں کہ بے چینی کی وجہ نہ نرم بستر پر آرام آرہا ہے نہ ہی ہموار زمین پر۔

حوالہ جات:

1۔ ڈاکٹر فضل خالق۔ 2021۔ اٹلس ورد۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، ص۔ 299

2۔ اصغر محرم وغیرہ۔ 2012۔ آدینک گیشین جاک۔ بلوچستان اکیڈمی تربت۔ ص۔ 38

3۔ واحد بزدار۔ 1988۔ قدیم بلوچی شاعری کا تنقیدی جائزہ۔ قومی ادارہ برائے مطالعہ پاکستان، قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد۔ ص۔ 115

4۔ شے رگام۔ 2017۔ پ قفاں کو ہیں چو وش عیب انت۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ ص۔ 103

ڈیہی

ڈیہی مشرقی بلوچستان کا مقبول ترین لوک گیت ہے۔ ڈیہی میں عشق و محبت کے بیانات، دوری کے کیفیات عزیز و اقارب کی یاد، فتح کی خوشیاں، شکست کے غم، بہادری پہ افتخار، خوش آئند مستقبل کے خواب، وطن سے پیار، وطن کی بہاریں، علاقے کی قحط سالی، لہلہاتے کھیت، سرسبز چراگاہیں، بل کھاتی ندیاں، چرواہے کی مویشیوں اور رہوڑیوں سے باتیں، بہتے پانی کا شور، طبقاتی کشمکش، مفلسی اور ناداری اور استحصال کے مصائب کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ڈیہی دمبورہ، سروز، نڑ اور دونلی جیسے ساز کے ساتھ کہا جاتا ہے۔

ویسے تو تمام شاعری کا تعلق وطن اور زمین کے ساتھ مضبوط و مستحکم ہوتا ہے لیکن "ڈیہی" اپنے نام سے واضح ہوتا ہے اور لفظ "ڈیہہ" وطن سے نکلا ہے۔ دوسری جانب تمام لوک شاعری کی نسبت اس صنف کا تعلق وطن اور زمین سے زیادہ جڑا دکھائی دیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ڈیہی وطن اور زمین کا دوسرا نام ہے۔ جس میں وطن، زمین اور اس سے جڑی ہر بات تذکرہ ملتا ہے(1)۔

ڈیہی کے پہلے مصرعے کا وزن چھوٹا اور دوسرے کا بڑا ہو سکتا ہے۔ اس کا پہلا مصرعہ بے معنی و بے مطلب ہوتا ہے تاہم دوسرے مصرعے میں معنی ضرور ہوتا ہے۔ ڈیہی میں محبوب کے سراپا بیان، قد و قامت، صورت و سیرت، دکھ و فراق، عشق کی فریاد، فراق یار کی کیفیت، وطن اور زمین کے ساتھ تعلق جیسے موضوعات کو دلکش انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ ڈیہی کی زبان کی دلکشی اور شیرینی ایسی ہوتی ہے جیسے بادِ صبا کے لمس پھولوں کو چھو رہے ہوں۔ ڈیہی میں ہر جذبہ اور مسئلہ سیدھے سادے انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ قدیم ڈیہی تین مصرعوں پر مبنی ہوتا تھا۔ اب جدید رنگ میں دو مصرعوں پر مشتمل ڈیہی بھی سامنے آ چکا ہے۔ تین مصرعوں پر مبنی ڈیہی جاپانی

شاعری کی صنف "ہائیکو" سے قربت رکھتی ہے(2)۔

ڈیہی بہت خوبصورت اور بہت مقبول صنف ہے جسے ہر عام و خاص، پیر و جوان، عاشق و غیر جانبدار اور مرد و زن کہتے بھی ہیں اور گاتے بھی ہیں۔ یہ جدائی کی تانگ، انتظار کی بار مہلک کیفیات اور ملاقات و وصل کے جلا ڈالنے والے مگر سکون آور لمحوں کے جذبات کے اظہار کی بے مثل صورت ہوتی ہے۔ اس کے گانے کے لیے نہ موقع محل کی ضرورت ہوتی ہے، نہ اجازت و پروانہ کی حاجت ہوتی ہے، نہ موسم و وقت کی قید اور نہ تنہائی و محفل کی بندش۔ یہ مویشی کی چراگاہ میں بھی سخن سرا ہو سکتا ہے اور کاروانوں میں اونٹ پر ہچکولے کھاتے ہوئے اس کا نزول ہو سکتا ہے۔ یہ محفلوں کی زینت بھی بن سکتا ہے اور بیت بازی کی طرح مقابلوں میں بھی موجوں کی طرح آن دھمکتا ہے۔ کٹھن چٹانوں کی بازگشت میں بھی ڈیہی گونج سنی جا سکتی ہے اور رات کے پچھلے پہر گھپ خاموشی میں بھی ہل چلاتا ہوا کسان بھی اسے گا سکتا ہے۔ دور افتادہ ندی نالوں میں لکڑیاں چنتی عورتیں بھی نرم لے میں ڈیہی گاتی ہیں اور میٹھے پانی کے تالابوں میں پانی بھرتی خواتین بھی اسے چہک سکتی ہیں۔ اس صنف میں بلوچی ادب کی دیگر اصناف سوت، لاڈوک اور زہیروک کی جھلک بھی پائی جاتی ہے(3)۔

حوالہ جات:

1۔ واحد بخش بزدار۔ 2001۔ ڈیہی ودروشم۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ ص۔ 15
2۔ اصغر کریم و غیرہ۔ 2012۔ آریک گیمین تاک۔ بلوچستان اکیڈمی تربت۔ ص۔ 33
3۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری۔ 2009۔ مختصر تاریخ زبان و ادب بلوچی، مقتدرہ قومی زبان پاکستان اسلام آباد۔ ص۔ 121

آمبا

امبا سونمیانی سے لے کر جیونی جفاکش ماہی گیروں کے سمندر کے تند و تیز لہروں کے ساتھ مقابلہ کرنے کا گیت ہے۔ اس ساحلی پٹی پر آباد اکثر بلوچوں کا گذر بسر ماہی گیری پہ ہے۔ یہ ساحلی پٹی عہد قدیم سے بڑی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ یہاں سے مختلف علاقوں اور ملکوں کے ساتھ تجارت ہوا کرتی تھی۔ سمندری تجارت کو محفوظ کرنے کے لئے پرتگیزیوں کے خلاف جنگ کے دوران سولہویں صدی کا بلوچ ہیرو حمل وجیئند اسی سمندر سے گرفتار ہوئے۔ سکندر اعظم نے اپنے ایک سپہ سالار نیر کس کو اسی بحری راستے سے بھیجا، اس کے علاوہ لاتعداد سیاح، مورخین، محققین کی گذرگاہ رہی۔ یہاں کے قدیم آثار ایک نئی دنیا سے روشناس کرانے کے لئے چھلک رہے ہیں لیکن ہمارا موضوع بحث جفاکش ماہی گیروں کا لوک گیت "امبا" ہے۔ "امبا، محنت کشوں کے اجتماعی کام میں طاقت ملا کر زور لگانے کا گیت ہے۔ بالخصوص محنت کش ماہی گیر کا"(1)۔

امبا ساحلی علاقے کی بلوچی لوک شاعری کی صنف ہے۔ یہ ماہی گیروں کے زندگی کے ساتھ منسلک شاعری ہے۔ یہ صنف کلی طور پر سمندر، مچھلی، لہروں، کشتی، ملاح اور ساحلی صورت حال سے تعلق رکھتی ہے۔ جب ماہی گیر مچھلی کی شکار کے لئے سمندر کا رخ کرتے ہیں تو اپنے وقت گذارنے کے لئے مل کر خوش الحانی سے امبا کہتے ہیں۔ یہ صنف خوشی و شادمانی کا گیت ہے اور ان اشعار میں سمندر، مچھلی، کشتی سے منسلک اشیا کے بارے میں بیان موجود ہوتا ہے۔ ان اشعار میں ماہی گیروں کے پیار و محبت اور دوستی و سخاوت کی کہانیاں بھی بیان کی جاتی ہیں۔ امبا اکیلے نہیں کہا جاتا ہے بلکہ اکٹھے مل کر الحان میں گایا جاتا ہے۔ ایک پہلا مصرعہ کہتا تو دوسرے ملکر دوسرا مصرعہ پورا کرتے ہیں(2)۔

یہ گیت ماہی گیروں کی زندگی کے ساتھ وابستہ ہے۔ ماہی گیر مچھلی کے شکار کے لئے سمندر میں جاتے ہیں۔ تو اپنا وقت گزارنے اور خود کو خوش رکھنے یا تو نیند بھگانے کے لئے اکٹھے ہو کر یہ گیت گاتے ہیں۔ مچھلی کے شکار کے بعد خوشی میں گیت کو الاپ کرتے ہیں(3)۔

اکثر ان گیتوں میں کہانیاں و گیت، قدیم شاعری کا مصرعہ، کلاسیکل و نیم کلاسیکل دور کی شاعری کا تکرار دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہم یہ بات علی الاعلان کہہ سکتے ہیں کہ اسپانے پانی اپنے ہی چشمے سے پیا ہے۔ لیکن کہیں کہیں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ جب کپڑا پھٹتا ہے تو اسے رفو کرنے کے لئے دوسرے کپڑے کا ٹکڑا لگایا جاتا ہے۔ اس لئے حیران نہیں ہونا چاہئے کیونکہ پوری دنیا میں اسپانا کا یہ مزاج ہے۔ ملا فاضل کی شاعری کے مصرعے بھی آپ دیکھ سکتے ہیں۔ تو عالی کے رنگمر میں بیٹھ کر کشتی کو دیکھنے کا نظارہ بھی اس میں ملتا ہے۔ بیرگ کے گراناز سے بات چیت بھی ملتا ہے۔ حضرت علی بن ابی حنیفہ کی طویل شعری داستان بھی یہاں ملتی ہے(4)۔

اسپا جاکش ، ہی گیروں سمندر کے تند و تیز لہروں کے ساتھ مقابلہ کرنے کا گیت ہے۔۔۔۔۔۔۔ یہ گیت ان کی محنت کی عظمت کا اظہار ہے۔ یہ گیت ان کے جذبوں کو گرماتا ہے۔ جب وہ ہفتوں اور مہینوں سمندر میں رزق کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ وہاں پہ گھر سے دوری کے دوران تنہائی کے لمحوں میں سمندر کی لہروں کے زیر و بم کو ملا کر اپنا گیت الاپ کرکے نہ صرف اپنا اکیلا پن دور کرتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کو ہمت و حوصلہ بھی فراہم کرتے ہیں۔ کورس کے انداز میں گیت گانے سے خاموشی ٹوٹتی ہے۔ ناخدا (ملاح) پہلا مصرعہ کہتا ہے اور اس کے ہمراہی دوسرا مصرعہ بول کر جواب دیتے ہیں۔ یوں سمندر کی لہروں کی آواز کے ساتھ مچھیرے اسپا کے سریلے گیت بول کر سمندر کا سینہ چیر رہے ہوتے ہیں۔ محققین کے مطابق اسپا کو موضوعاتی اور فنی اعتبار سے تقسیم کیا جاتا ہے۔ موضوعاتی اعتبار سے اس میں سمندر میں جانا، سمندر سے نکلنا، سمندر و سمندری حیات، کشتی اور بادبان، مذہبی اور پیار و محبت کے عنوان ملتے ہیں جبکہ فنی و تیکنیکی اعتبار سے اس کے اشعار بحر کے حساب سے لمبے، درمیانے اور چھوٹے، حجم کے اعتبار سے بڑے، درمیانے اور چھوٹے، کیفیت کے حساب سے جوابی اور تکراری اور صنفی اعتبار سے خواتین اور مردوں کے زبانی کہے جاتے ہیں۔

اسپا کے بارے میں مختلف کتب میں ابتدائی معلومات دستیاب ہیں۔ تاہم اسپا پہ ڈاکٹر

فضل خالق کی کتاب "امبا" زند اکیڈمی تونسہ کی جانب سے 2021 اور "الاسو" 2020 میں بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ کی جانب سے شائع ہوئے۔

حوالہ جات:

1۔ شاہ محمد مری۔ 2009۔ مختصر تاریخ بلوچی زبان و ادب۔ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد۔ ص۔54

2۔ اصغر عزم و دیگر۔ 2012۔ آزمانک گچین۔ بلوچستان اکیڈمی تربت۔ ص۔35

3۔ صبا دشتیاری۔ 2015۔ گلکار و چنکار۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ کراچی۔ ص۔272

4۔ ڈاکٹر فضل خالق۔ 2021۔ الاسو۔ بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ۔ ص۔12-13

لیلیکو

لیکو یا لیلیکو بلوچی لوک ادب کی ایک اور دلکش صنف ہے۔ یہ گیت شتر بانوں، سار بانوں اور چرواہوں میں زیادہ مقبول ہے اور خاران اس گیت کا مرکز ہیں اور افغانستان اور ایران میں آباد بلوچوں میں بھی خاصہ مقبول ہے۔ یہ گیت مسافرت کے کرب، جدائی کے دکھ اور وصال کی کیفیات بیان کرتا ہے۔ اس میں گلہ بانی اور پہاڑوں، بیابانوں، چراگاہوں میدانوں کی منظر کشی نمایاں ہوتی ہے۔ یہ صنف کہیں کہیں زہیروک کے ساتھ مماثلت رکھتی ہے لیکن اس کی دھن اسے زہیروک سے ممیز کرتی ہے۔ یہ گیت اکثر و بیشتر دونلی یا سروز کے ساتھ گایا جاتا ہے۔

اس گیت میں جدائی کی غمزدہ کیفیات کو اپنی آواز میں الاپ کر کتھارسس کا سبب پیدا کیا جاتا ہے۔ سفر کے علاوہ شتربان اور چرواہا اس کو گاتے ہیں۔ اس میں اپنے ارد گرد کی خوبصورتی، پہاڑ، دامان اور جنگل کی باتیں دھیمی انداز اور پُر سوز انداز میں کی جاتی ہیں۔ چرواہے کے لئے چراگاہوں اور جنگلوں میں اپنے پیاروں کو یاد کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ موسیقی کے اعتبار سے زہیروک سے قربت رکھتا ہے۔ تاہم زہیروک سے الگ ہے۔ دونلی اور سروز کے ساتھ گایا جاتا ہے۔ یہ ایک لوک گیت ہے اس لئے کسی مخصوص شاعر یا طبقے کا نہیں بلکہ عوام کا گیت ہے۔ کہیں کہیں ڈیہی سے بھی نزدیکی رکھتا ہے۔(1)۔

حوالہ جات:

ڈاکٹر فضل خالق۔2021۔ اُلس ورد۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، ص۔218

لیلیٰ مور

لیلیٰ مور بلوچستان کے علاقوں ساراوان، جھالاوان، خاران، نوشکی وغیرہ میں یکساں طور پر مقبول ترین گیت ہے جو بہ یک وقت بلوچستان کے بلوچوں کی دونوں بڑی زبانوں یعنی بلوچی و براہوئی زبان میں گایا جاتا ہے۔ لیلیٰ مور میں ہر طرح کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ اس صنف میں وجہ تمیز اس کی مخصوص دھن ہے۔

وسطی بلوچستان کا یہ بے حد مقبول گیت بلوچوں کی دونوں بڑی زبانوں بلوچی اور براہوی میں کہا جاتا ہے۔ اس کو مخصوص دھن میں گایا جاتا ہے۔ اس میں زندگی کے بہت سارے موضوعات ملتے ہیں (1)۔

حوالہ جات:

ڈاکٹر فضل خالق۔ 2021۔ اُسس ور۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، ص۔ 207

شاعری

اپنے جغرافیائی خد و خال کے مطابق بلوچ پہاڑوں، وادیوں، بیابانوں، دشت، صحرا، گھاٹیوں، چراگاہوں اور میدانوں میں بود و باش رکھتے ہوئے چرند و پرند کے ساتھ ساتھ بادل، بارش، کہر، بجلی کی چمک، تند و تیز آندھی، جھلساتی ہوئی لو، گودا جما دینے والی یخ بستہ ہوائیں، طوفان و جھکڑ، بپھرے ہوئے پہاڑی و میدانی ندی نالوں کی طغیانی، موسم بہار میں گوہ رخ "گل لالہ" کے پھولوں سمیت متعدد جنگلی پھول و شجر کے ساتھ اس کے پُر کیف شب و روز کے مناظر، بے آب و گیاہ پہاڑوں اور پہاڑی دامنوں، سبز گھاس، قدرتی جڑی بوٹیوں، دلکش پھولوں کی مہکتی خوشبو، مال و مویشی سے وابستہ روشن مستقبل کی اُمید کی خوشی، صدیوں کے سفر پر محیط داخلی و خارجی محاذ آرائیوں میں تلوار، تیر کمان، اسلحہ اور بندوق کے استعمال کی خاص مہارت، انگنت مہر و محبت کے داستانوں کی رنگینیاں، قبائلی و اجتماعی رنج و غم و الم کی پُر سوز کہانیاں، شکوہ و شکایت سے لبریز لہجہ، راتوں کی محافل، ماؤں کی لوریاں، بہنوں کے نازینک، پہلوانوں و دوہی کے قصہ و کہانیوں جوانوں کے ذہنی، و ستائش، لیلڑی، مُنیکو، لیلی مور، زہیروک کے ساتھ ساتھ جدید دور کی انگنت ایجادات کے فوائد اور حشر سامانیوں کے درمیان زندگی بسر کرتے چلے آرہے ہیں۔

شاعری حالات و واقعات کی ترجمان ہوتی ہے اور اس معاشرے اور ماحول کی عکاسی کرتی ہے جس میں شاعر رہتا ہے۔ صرف فن شاعری ہی شاعری کا موجد نہیں، بلکہ وہ جذبات جو شاعر کو شعر کہنے پر مجبور کریں، شاعری ہیں۔ اس کی تعریف ایسے بھی مناسب ہے، شاعری ان منظم جذبات کا نام ہے جو فی البدیہہ نازل ہوتے ہیں۔ تاریخ انسانی کے ہر دور میں یہ خیال کیا جاتا رہا ہے کہ شاعر کے اندر کوئی ایسی پُر اسرار طاقت یا صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ جس کے باعث اس کا طرز فکر و احساس اور اس کا طریق ابلاغ و اظہار عام آدمیوں سے مختلف اور زیادہ موثر ہو جاتا ہے۔ یہ عطیہ الٰہی

فیضانِ ایزدی نوائے سروش یا فنون کی مقدس دیویوں کا عطیہ ہے۔

بلوچی شاعری بھی ہر دور میں بلوچوں کے حالات، واقعات، جغرافیائی، معاشی، سماجی اور ثقافتی صورت حال کی خوبصورت انداز میں عکاس ہے۔ بلوچی شاعری راست گوئی، راست بازی، مہر و محبت، حریت و غیرت، سخاوت، مہمان نوازی، باہوٹ (پناہ میں آنے والے) کے عزم و استقلال اور اخلاص کے اصولوں پر پابند نظر آتی ہے۔ اس سے واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ بلوچی ادبی ورثہ معاشرتی زندگی کی عکاسی میں اختراعی بیانات کی بجائے حقیقت پر مبنی زندگی کی عکاسی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ محققین لکھتے ہیں کہ بلوچی کلاسیکل شاعری ارد گرد کی موجودہ دور کی زبانوں سے زیادہ دنیا کے قبل مسیح کی کلاسیکل شاعری جیسا کہ یونان کے ہومر کے "اوڈیسی" اور "ایلیڈ"، سنسکرت کے "رامائن" اور "مہابھارت"، سومیری کے "گلگمش" اور "سونگ بائدا" اور عربی کی نظم کی ہیئت کے "زجل" سے زیادہ تعلق اور نزدیکی رکھتی ہیں۔

سولہویں صدی کے اواخر یا سترھویں صدی کی ابتدا میں جو شاعری شروع ہوئی تو پھر سترھویں صدی کے آواخر تک بلوچی قدیم کلاسیکل شاعری سادہ، پر جوش اور حقیقت پر مبنی تھی۔ اس لئے ان کی زبان خالص اور ملاوٹوں سے پاک تھی۔ شاعری کا دارومدار بعض واقعات کا من و عن بیان، حالات کی تشہیر اور قلبی وارداتوں کا اظہار ہے۔ بلوچ کلاسیکل شعرا کی زبان سادہ، طرزِ بیان موثر اور مضمون حقائق کی تصویر کشی سے بہرہ ور ہے۔ بلوچی کلاسیکل شاعری صحیح معنوں میں عوام کی شاعری ہے۔ ان قدیم اشعار میں آج بھی دلوں کی دھڑکن سنائی دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صدیاں گذر جانے کے بعد بھی ان کی تازگی اور شگفتگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اپنی شبینہ محفلوں میں اب بھی بلوچ ان نظموں کو گاکر مسرت و روحانی فرحت اور قلبی تسکین حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کا ہر مصرعہ شاعر کے دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا ہوتا ہے۔ جو ایک غیور بلوچ کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس لئے آج بھی دل پر اسی طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ جس طرح آج سے صدیوں قبل اثر انداز ہوتا ہوگا۔ بلوچی شاعری کی یہی صفت ہے جس نے اسے ابدیت بخشی ہے۔ ہر سنجیدہ بلوچ اسے اپنا قومی فریضہ سمجھتا ہے کہ ان اشعار کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں یاد کر کے گائے اور اپنی قومی عصبیت کو زندہ و تابندہ رکھے۔ یہی وجہ ہے کہ صدیاں گذرنے کے باوجود چاکر و گہرام، شہ مرید و حانی، حمل و جیئند اور بالاچ گورگیج و قیصر وغیرہ کی درجنوں نظمیں بلوچوں میں سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہیں۔

بلوچی شاعری تو صدیوں بلکہ ہزارہا سال کا تسلسل ہے۔ تاہم سولہویں صدی کے دستیاب شہ پاروں سے تاحال کے سفر کی جانچ پڑتال اور تحقیق کے اعتبار سے مورخین و محققین نے اسے چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ جن میں قدیم کلاسیکل یا رندی عہد، خوانین قلات کا عہد، انگریز کی آمد کا عہد اور جدید دور قابل ذکر ہیں۔

ا۔ رندی عہد یا کلاسیکل دور

پندرہویں اور سولہویں صدی کے رند ولاشار کی مرکزیت میں میر چاکر رند کے سربراہی کا دور ادبی لحاظ سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس سے قبل کے ادوار کے بلوچی زبان کے ادبی شہ پارے ناگزیر وجوہات کی بنا پر ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ جس کی وجہ سے میر چاکر رند کے دور کے ادب کو ابتدائی کلاسیکل ادب کا درجہ ملتا ہے۔

مورخین کے مطابق چاکر کے عہد میں بلوچی زبان ایک بالغ زبان تھی اور دنیا کی دیگر زبانوں کے ہم پلہ ادبی، ثقافتی اور سماجی اظہار بھرپور انداز میں کر رہی تھی۔ سچ یہ ہے کہ دوسری کسی بھی زبان کی طرح بلوچی زبان بھی بنی بنائی شکل میں چاکر و شہ مرید کو نہیں ملی بلکہ صدیوں کی تجرباتی کوششوں سے پیدا ہونے والی منطقی روایت کے نسل در نسل منتقل و متغیر ہونے کا نتیجہ ہے۔

یہ دور اولی حالات سے اس لئے بھی اہم قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں کئی رومان ظہور پذیر ہوئے۔ ان رومانوی داستانوں کا ہی اثر ہے کہ بلوچی شاعری کے مزاج میں رزمیت کے ساتھ ساتھ رومانیت کا عنصر بھی بھرپور انداز میں ملتا ہے جو بعد میں اس شاعری کا حصہ بن گیا یعنی اسی دور میں رزمیہ شاعری اور عشقیہ شاعری کی بنیاد پڑی۔ جس میں بلوچ فطرت اور مزاج، معاشی و معاشرتی حالات اور تہذیب و ثقافت کے رنگ نمایاں نظر آتے ہیں۔

رندی عہد میں میر چاکر رند اور میر گہرام لاشاری کی تیس سالہ جنگ کے دوران نوک جھونک کی شاعری، حانی و شہ مرید کی عشقیہ داستان کی شاعری، بیبرگ و گراناز کی عشقیہ داستان کی شاعری، شہداد و مہناز کی علیحدگی اور اس کے بعد کی شاعری، ریحان رند، بکر لاشاری، میران رند، میر سحاق و شلی کی عشقیہ داستان، میر چاکر خان و بیبتان خان کے متعلق نظم، چاکر خان و جاڑو جلم کے متعلق نظم، نوذبندغ کے متعلق نظم، دل ماسخ کے متعلق نظم، شہداد کی ولادت کے متعلق نظم، لاکھو نوذبندغ، بیبتان و حمل و جیئند کے بارے میں شاعری، دودائی اور رند کے جنگ کی

رزمیہ شاعری، دبلی جنگ کی رزمیہ داستان، بالاچ گورگیج اور ہیبرگ کی لڑائی کی شاعری سمیت دیگر فن پارے بلوچی ادب کے انمول شہ پارے شمار کئے جاتے ہیں۔

2۔ خوانین قلات کا عہد۔

قلات 1650 سے 1948 تک خوانین کے زیر کمان بلوچوں کا پایہ تخت رہا ہے۔ اس دوران قلات نے انگنت ابھار چڑھاو دیکھے اور یہاں سے انفرادی طور پر متعدد علاقوں پر یلغار بھی کی اور یہاں کے حاکم مختلف اتحادیوں کا حصہ بن کر قرب وجوار کی اقوام، ملکوں اور علاقوں پر ٹوٹ پڑے۔ تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ بلوچ یہاں کے قدیم باشندے ہیں اور امیر کیکان کرد بلوچ کے 854 قبل مسیح میں امیر بننے سے قبل اس کا نام "بنجیران" تھا اور اس کے بعد کیکان اور قلات کا نام اختیار کر گیا۔ کرد گال نامہ میں بتایا گیا ہے کہ امام حسینؓ کی شہادت کے بعد جن 116 اکرد بلوچ قبائل نے سوگ میں حصہ لیا ان میں سیوائی کرد قبیلہ بھی شامل تھا۔ انگنت حشر سامانیوں کا سامنا کرتے ہوئے اس دور میں ادبی شہ پارے تخلیق ہوئے۔ تاہم یہاں مجھے قلات کی تاریخ کے بجائے مورخین و محققین کی جانب سے سترہویں صدی میں خوانین قلات کے دور میں ادب کا جائزہ لینا ہے۔

محققین لکھتے ہیں کہ خوانین قلات کے عہد میں درباری زبان فارسی تھی، اس وجہ سے فارسی میں شعر کہنے کا رواج ہوا۔ فارسی کے ساتھ خوانین قلات نے بلوچی کی سرپرستی بھی کی۔ اس دور کی بلوچی شاعری نے نیا رخ اختیار کیا۔ رزمیہ شاعری کے ساتھ ساتھ عشقیہ شاعری بھی ہونے لگی، بلکہ عشقیہ شاعری زیادہ ترقی کرنے لگی اور اس شاعری میں نہ صرف عوام کی زندگی کی ترجمانی کی گئی بلکہ امیر طبقہ کی زندگی کی عکاسی بھی کی گئی۔ اس دور میں مذہبی شاعری کی بنیاد بھی پڑی۔ آگے چل کر اس کا رواج ہو گیا۔

اس دور میں ہمیں لعل و گراناز کی عشقیہ داستان کی شاعری، شیرین و دوستین کے عشقیہ داستان کی شاعری، عزت و میرک کی عشقیہ داستان کی شاعری، سیمک نتھا کی جدائی پر انمول موتیک، کلیستوں اور برفتوں کے درمیان جنگ کی رزمیہ شاعری، عثمان کلمتی، ممل رند، شہ مبیٰ، شہریار، جام درک، ناطق مکرانی، حاجی درانی، بہار، میر اشرف، سُوہنا میریانی، کوہل جت، ملا ابراہیم وغیرہ کے اشعار بلوچی ادب کی زینت بنتے نظر آتے ہیں۔ خوانین قلات کے ادب کو 1650 سے 1890 تک کے دور پر مشتمل عہد کو کہا جاتا ہے۔ اس دور میں جام درک بلوچی مقبول ترین شاعر کہلاتے ہیں۔

3۔ انگریزی عہد۔

برصغیر سے جب انگریز افغانستان کی جانب پیش قدمی کرکے روس کا راستہ روکنے کے لئے آگے بڑھے تو یہاں پر انہیں طرح طرح کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ بالادست طبقہ ان کا حواری بن گیا۔ یوں ان کی ملی بھگت سے بلوچ معاشرے میں صدیوں سے مہذب طریقے سے اپنا قبائلی سربراہ منتخب کرنے کے رائج قبائلی جمہوری نظام کو تبدیل کرکے سرداروں کو خطابات سے نواز کر انہیں موروثی سردار بنانے کی داغ بیل ڈالی گئی۔ جس کی وجہ سے بلوچ معاشرتی ہیئت تبدیل ہو گئی۔ اختیارات قبیلے یعنی اجتماعیت سے سردار یعنی فرد کے ہاتھ میں چلے گئے۔ جس کا خمیازہ بلوچ قوم کو پسماندگی، غربت اور استحصال کی شکل میں بھگتنا پڑا۔ اس دور کو بلوچستان میں غلامی کی ابتداء کا دور کہا جاتا ہے۔ مورخین کے مطابق 1843 میں انگریزوں نے سندھ پر قبضہ کر لیا۔ 1854 میں انگلستان اور روس کی جنگ کی وجہ سے انگریزوں نے خان قلات سے نیا معاہدہ کیا۔ اس کے بعد بلوچستان کی آزادی ختم کر دی گئی۔ انگریزوں کی سازش کی وجہ سے خان قلات اور سرداروں کا آپس میں مقابلہ ہونے لگا، جس کی وجہ سے بلوچوں کی طاقت کمزور ہو گئی۔ انگریز بلوچوں کی طاقت کمزور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس ظلم و جبر کے دور کا نتیجہ یہ نکلا کہ بلوچی شعرا کا میلان تصوف اور اخلاقیات کی طرف راغب ہوئے۔ وہ روحانیت اور تصوف میں قلبی سکون حاصل کرنے لگے اور اخلاقیات کے سبق سکھانے لگے۔ اس وجہ سے اس دور کی شاعری میں نعتوں، معجزوں اور مداحوں کا منظوم ذخیرہ ملتا ہے۔

13 نومبر 1839 کی میر محراب خان کی شہادت، مریوں کے ساتھ انگریزوں کی جنگ نفسک، گوک پروش میں انگریزوں کے ساتھ بلوچوں کی محاذ آرائی، نورالدین مینگل المعروف نورا مینگل کی انگریزوں کے ساتھ جنگ۔ اس طرح مریوں کی انگریزوں کے ساتھ جنگ گمبد اور جنگ ہڑب، مغربی سرحدی بلوچستان پر جنرل ڈائر کی چڑھائی۔ ان سب واقعات نے خوف کی وجہ سے یہاں پر ظاہری طور پر مذہبی شاعری کو فروغ دیا لیکن درون خانہ ایک انگارے کو جنم دیا۔ مذکورہ بالا واقعات کے عنوان سے جو حریت پسند، رزمیہ، مزاحمتی شاعری ہوئی اس کے شاعر نا معلوم نظر آتے ہیں۔ تاہم اس دور میں رحم علی مری کھل کر مریوں کے انگریزوں کے ساتھ جنگ کی داستان رزمیہ اشعار میں قوم کے جذبوں کو ابھارتے نظر آتے ہیں۔

اس دور کے بلوچی ادب نے ہر صنف میں اپنا سفر جاری رکھا۔ شیرو آلاق سمو بلی مست یعنی مست توکلی رسمی عشقیہ داستان اور بیرک و گراناز کی عشقیہ داستانوں کی شاعری سامنے آتی ہے۔ اس کے علاوہ ابراہیم شنبانی، لشکر خان جسکانی، ملا بہرام، جیو آکرد، حیدر بالاچانی، رحم علی مری، ملا عمر مری، پنجو بگلانی، پہلوان فقیر، احمد بن شوران، مولوی حضور بخش جتوئی، غلام محمد بالاچانی، پیچکھا بزدار، سنگت، منڈو کسیری، جوانسال بگٹی، ملا محمد خان مری، نور محمد بمپشتی، جمعہ خان کلوانی، ملا اسماعیل، سید نور شاد وغیرہ شاعری کے میدان میں طبع آزمائی کرتے نظر آتے ہیں۔ اس دوران مکتبہ درخانی کی بنیاد بھی پڑی جو مذہبی کتب شائع کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جس کا مقصد مذہبی تعلیم اور اشاعت کے ذریعے انگریزوں کا مقابلہ کرنا تھا۔

4۔ جدید دور

جدید دور میں 1947 سے 1970 تک کی شاعری کو شامل کیا جاتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب صدیوں سے سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی جدید شاعری کو تحریری شکل دینے کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ کراچی اور بلوچستان میں ادبی ادارے قائم ہوتے ہیں۔ بلوچی کے رسائل شائع ہونے لگتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان کراچی، بلوچی کے پروگرام نشر کرنا شروع کر دیتا ہے۔ بلوچی اکیڈمی کراچی کی بنیاد ڈالی جاتی ہے۔ لٹ خانہ کا قیام ہوتا ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی کوئٹہ میں شاخ کا قیام عمل میں آتا ہے۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ قائم ہو جاتی ہے۔ سید ظہور شاہ ہاشمی اکیڈمی کراچی، آزات جمالدینی اکیڈمی، کراچی، ملا فاضل اکیڈمی، کراچی اور مند تربت، عزت اکیڈمی پنجگور، بلوچی ادبی بورڈ کراچی، سنگت اکیڈمی، لبزانکی کاروان، بلوچستان اکیڈمی، راسکو ادبی دیوان، نصیر کبدانی لبزانکی دیوان وغیرہ جیسے ادبی ادارے اور متعدد طباعتی ادارے قائم ہوتے ہیں۔ یوں بلوچی شاعری میں مندرجہ بالا حالات اور واقعات کے پس منظر میں جدید بلوچی شاعری کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ نئے شعور اور جذبے کے ساتھ منزلیں طے کرنے کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دور کے شعراء میں سید ظہور شاہ ہاشمی، کریم دشتی، میر گل خان نصیر، آزات جمالدینی، جی آر ملا، عطا شاد، میر عیسیٰ قومی، مراد ساحر، صدیق آزات، اسحاق شمیم، ملک محمد رمضان، قاضی عبدالرحیم صابر، احمد جگر، دوست محمد بیکس، احمد زہیر، بشیر بیدار، توم حقانی وغیرہ شامل ہیں۔ عصر حاضر کی بلوچی شاعری اور ان کے اصناف پر آگے چل کر بات ہوگی۔

مزاحمتی شاعری

بلوچی مزاحمتی شاعری کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ جس کو بلوچی میں "گنگیری شاعری" کہا جاتا ہے۔ کلاسک شاعری کے دور سے لے کر عہد حاضر کے بلوچی شعرا نے ظلم و جبر، استحصال اور ناانصافی کے خلاف اپنی تخلیقات سے اپنے دور اور زمانے میں نمائندگی کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ اکثر ہمارے معاشرے کے کچھ گنے چنے لوگوں کو مزاحمتی ادیب یا شاعر سمجھتے ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ شخص جس کے ذہن میں شعور ہوتا ہے کسی نہ کسی شکل میں وہ مزاحمت کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کچھ لوگ اس پر قلم اٹھا کر معاشرے کو اس کی برائی سے آگاہ کرتے ہیں۔ کچھ دیگر طریقوں سے اس کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں۔

بلوچی کلاسیکل شاعری کا پہلا اہم موضوع جنگ و مزاحمت ہے۔ ان میں باہمی جنگوں سے لے کر اغیار کے خلاف برسرپیکار جنگ و مزاحمت شامل ہیں۔ مشہور مزاحمتی و جنگی اشعار میں میر بالاچ کی مزاحمتی شاعری، میر عمل کی مزاحمت کے بارے اشعار، میر چاکر رند اور میر گواہرام کی باہمی جنگ کے اشعار، میر کمبر کے جنگ کے اشعار اور ہانی و مہناز کے مزاحمتی اشعار شامل ہیں (1)۔

بلوچ سماج اور بلوچی ادب میں مزاحمت کی دو شکلیں ہمیشہ دو ردیوں کی طرح آپس میں مدغم ملیں گی۔ مزاحمت کی ایک شکل تو وہی ہے جو ہر جگہ پائی جاتی ہے یعنی کسی ظالم یا غاصب کے خلاف مزاحمت کرنا لیکن مزاحمت کی دوسری شکل ذرا پیچیدہ اور خالص داخلی قسم کی ہے۔ یعنی بلوچی اقدار کی آبیاری کرتے ہوئے اپنے نفس اور اپنی ذاتی مفادات کے خلاف اس وقت تک مزاحمت جب تک کہ بلوچی اقدار اس فرد کی ذاتی منفعت سے بازی نہ لے جائے۔ دوسرے لفظوں میں اپنے اور اپنے اعزا کی مفادات اور زندگیوں کی قربانی دے کر ان اقدار کا احیا کرتا ہے۔ بلوچ سماج

مزاحمتی شاعری

بلوچی مزاحمتی شاعری کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ جس کو بلوچی میں "گنگیری شاعری" کہا جاتا ہے۔ کلاسک شاعری کے دور سے لے کر عہد حاضر کے بلوچی شعرا نے ظلم و جبر، استحصال اور ناانصافی کے خلاف اپنی تخلیقات سے اپنے دور اور زمانے میں نمائندگی کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ اکثر ہمارے معاشرے کے کچھ گنے چنے لوگوں کو مزاحمتی ادیب یا شاعر سمجھتے ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ شخص جس کے ذہن میں شعور ہوتا ہے کسی نہ کسی شکل میں وہ مزاحمت کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کچھ لوگ اس پر قلم اٹھا کر معاشرے کو اس کی برائی سے آگاہ کرتے ہیں۔ کچھ دیگر طریقوں سے اس کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں۔

بلوچی کلاسیکل شاعری کا پہلا اہم موضوع جنگ و مزاحمت ہے۔ ان میں باہمی جنگوں سے لے کر اغیار کے خلاف بر سرپیکار جنگ و مزاحمت شامل ہیں۔ مشہور مزاحمتی و جنگی اشعار میں میر بالاچ کی مزاحمتی شاعری، میر عمل کی مزاحمت کے بارے اشعار، میر چاکر رند اور میر گواہرام کی باہمی جنگ کے اشعار، میر کمبر کے جنگ کے اشعار اور ہانی و مہناز کے مزاحمتی اشعار شامل ہیں(1)۔

بلوچ سماج اور بلوچی ادب میں مزاحمت کی دو شکلیں ہمیشہ دو ردیوں کی طرح آپس میں مدغم ملیں گی۔ مزاحمت کی ایک شکل تو وہی ہے جو ہر جگہ پائی جاتی ہے یعنی کسی ظالم یا غاصب کے خلاف مزاحمت کرنا لیکن مزاحمت کی دوسری شکل ذرا پیچیدہ اور خالص داخلی قسم کی ہے۔ یعنی بلوچی اقدار کی آبیاری کرتے ہوئے اپنے نفس اور اپنی ذاتی مفادات کے خلاف اس وقت تک مزاحمت جب تک کہ بلوچی اقدار اس فرد کی ذاتی منفعت سے بازی نہ لے جائے۔ دوسرے لفظوں میں اپنے اور اپنے اعزا کی مفادات اور زندگیوں کی قربانی دے کر ان اقدار کا احیا کرتا ہے۔ بلوچ سماج

اور بلوچی ادب میں مزاحمت کی یہ دونوں شکلیں اجتماعی طاقت ور طریقے سے عیاں ہیں اور ان دونوں رویوں کے بلوچ نفسیات پر گہرے نقوش ہیں (2)۔

مزاحمت اور جنگ خون ورگ کی مانند بلوچ تاریخ کے ہمراہ ہے۔ قوموں کی تاریخ و ادب ہمیشہ قوم کی زندگی کا عکاس ہوتی ہے۔ ادیب و شاعر قومی مزاج کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔ ان کی رہن سہن اور ان کی جدوجہد اور عادت واطوار اور فطرت کو اجاگر کرتے ہیں۔ اس طرح جب ہم بلوچی شاعری وادب پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں بلوچی شاعری کے ہر دور میں مزاحمت کے موضوع دیگر موضوعات سے زیادہ ملتا ہے (3)۔

مزاحمتی ادب کے حوالے سے نئے فکر و خیال سامنے آئے ہیں۔ ہمارے قلم کاروں کی اکثریت نے اپنی تاریخی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے نہ صرف تاریک ادوار کو ریکارڈ کیا بلکہ اس کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہوئے پاکستانی ادب کو نئی سوچ و خیالات سے روشناس کرایا کہ آزادی و مساوات کے لئے جہاد اور ناانصافیوں کے خلاف جدوجہد نئی دانش کا اور مستقبل کا منشور ہے (4)۔

بلوچ شعرا کرام نے اپنے دور کے ہر مرو آہن کو موضوع سخن بنایا ہے۔ انہوں نے نہ صرف اپنی دھرتی پر ہر حملہ آور ظالم کے خلاف جدوجہد نہ صرف تلوار کے ساتھ کی بلکہ ان کے خلاف اشعار کے ذریعے اپنی نفرت کا اظہار بھی کیا ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ انسان کو اپنے وطن، اس کی مٹی اور اس کی آبادی کے ساتھ محبت ہے، جب بھی کوئی زور آور طالع آزما ان کی آزادروی کو متاثر کرتا ہے تو وہ اس کے خلاف ہر سطح پر نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ بلوچ شاعر بھی اپنی روایات اور مٹی سے گہری وابستگی کے ناتے مزاحمتی ادب میں اپنی تخلیقات کے ذریعے اپنے احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔

بلوچی کلاسیکل دور کے بعد آزات جمالدینی، میر گل خان نصیر، محمد حسین عنقا، سید ظہور شاہ ہاشمی، مراد ساحر، عطا شاد، کفایت کرار، اکبر بارکزئی، عبدالرحمن پہوال اور عبدالمجید گوادری ابتدائی شعرا ہیں جنہوں نے مزاحمتی شاعری کے حوالے سے نئی راہوں کا تعین کیا۔ نئی نسل کے نوجوان شعراء کی شاعری بھی ظلم و جبر کے خلاف آواز حق رہی۔ اس قافلے میں جی آر ملا، مبارک قاضی، بشیر بیدار، اللہ بخش بزدار، ڈاکٹر فضل خالق، رزاق نادر، الفت نسیم کے ساتھ ساتھ

انگنت شعرائے قومی اور مزاحمتی شاعری کے ذریعے بلوچی ادب میں گراں قدر سرمائے کا اضافہ کیا۔ مزاحمتی شاعری میں شاعر اپنی سرزمین سے عشق کرتا دکھائی دیتا ہے، وہ ظلم و جبر، ناانصافی، بھوک و افلاس کے خلاف جہاد کی تلقین کرتا ہے۔ وطن میں مہر و محبت، امن، ترقی اور خوشحالی کے رنگوں بھرے جیون کا آرزومند ہوتا ہے۔

سید ظہور شاہ ہاشمی کے کتب، نیشتیں سگار، ترانگ، سو ستیں گیوار، شندر، جزو تحمل، اسی طرح میر گل خان نصیر کی تمام کتب اور استاد عبدالمجید گوادری کی کتاب (گلیں باندات)، جی آر ملا کی کتاب "جزن" وفا بلنگ بزدار کی کتاب "بشکیں ارکہ موزنت" میں مزاحمتی شاعری کا عنصر نمایاں ہے۔ نئے شعرا کی شاعری جو کہ مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتی ہیں، ان میں مزاحمتی شاعری کا عنصر غالب ہے۔ اس میں مبارک قاضی کے مجموعوں زرنوشت، شاگ ماں سبزیں ساوڑ، منی عہد ءِ گم ءُ سُہر اور بانی منی نا تمیں وتن بھی اسی قافلے کے راہی ہیں۔

حوالہ جات:

1۔ غفور شاد۔ 2014۔ بلوچی کلاسیکل شاعری۔ بلوچستان اکیڈمی، تربت۔

ص۔ 243

2۔ غنی پہوال۔ 2016۔ بلوچی ادب مزاحمت (deedban.com /blog/bluchi-adab-aur-mazahmat)

3۔ غفور شاد۔ 2014۔ بلوچی کلاسیکل شاعری۔ بلوچستان اکیڈمی، تربت۔

ص۔ 209

4۔ ایوب بلوچ۔ 1990۔ ادبیات "مزاحمتی لبزانک بلوچی" اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد۔ ص۔ 2

5۔ مجاہد بلوچ۔ 2021۔ کتاب گچ۔ شعبہ بلوچی، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ

6۔ عرفان جمالدینی۔ 2021۔ کتاب شون۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

7۔ صبا دشتیاری۔ 2003۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 1۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

8۔ صبا دشتیاری۔ 2007۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 2۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

9۔ صبا دشتیاری۔ 2009۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 3۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

نظم نگاری

نظم جسے بلوچی زبان میں "لچہ" کہا جاتا ہے۔ نظم کا لفظ شاعری کی ایک خاص صنف کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جس کا مطلب اشعار کا ایسا مجموعہ جس میں ایک مرکزی خیال ہو۔ اس کے لئے کسی موضوع کی قید نہیں اور نہ ہی اس کی ہیئت معین ہے۔ اس سے مراد وہ نظمیں مقصود ہوتی ہیں جس کا کوئی حسین موضوع ہو۔ جس میں فلسفہ، بیانیہ، یا مفکرانہ انداز میں شاعر نے کچھ خارجی اور کچھ داخلی دونوں قسم کے تاثرات شامل کئے ہوں۔ بلوچی زبان میں شاعری کی تاریخ ہمیں پندرہویں صدی تک لے جاتی ہے۔ اس سے قبل ادبی سرمایہ ہم تک پہنچ نہیں سکا۔ بلوچ سماج میں شاعری کی پس منظر کو سید ظہور شاہ ہاشمی یوں بیان کرتے ہیں۔

"بلوچ قوم کے ہر قبیلے کے اپنے اپنے خاص شاعر ہوا کرتے تھے جو اکثر و بیشتر حکام کے دربار سے منسلک ہوا کرتے تھے جو حسب ضرورت یا حسب الحکم اپنے قبیلے کے آباؤ اجداد کی بہادری کی داستانیں، قبیلے کی لڑائیوں کے قصے، اپنی فتح اور دشمن کے شکست کی کہانی اور قبیلے کی دوسری معاشرتی اور اخلاقی خوبیاں نظم کر کے یونانی اور عرب شعراء کی طرح گویوں کو حفظ کروا کر بھیج دیتے تھے تاکہ اسے گاؤں گاؤں جا کر اسے عوام اور خواص تک پہنچائیں۔ اس کی مثال یونانی اوڈیسے (Odessey) اور ایلیاڈ (Ilyad) اور دیگر اشعار ملتی ہیں۔ یہ نظمیں مختلف موضوع اور جدا جدا مضامین پر مشتمل ہیں۔ مثلاً اشعار باوزن ہوتے ہیں اور پوری نظم ایک ہی وزن کی پابند ہے۔ وہ تم تمام نظمیں قافیہ بندی پر مبنی ہیں۔ نظمیں چھوٹی بھی ہوتی ہیں اور لمبی بھی......... بڑی نظموں کی لمبائی ساٹھ سے لے کر دو ڈھائی سو مصرعوں سے بھی تجاوز کر جاتی ہیں۔"(1)۔

نظم اور غزل بلوچی شاعری میں درآمد قرار دینے کے بارے ڈاکٹر شاہ محمد مری لکھتے ہیں۔

"نظم اور غزل دونوں بلوچی ادب کی اپنی اصناف نہیں ہیں بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ

شاعری کی جس بھی صنف کو کاغذ پر لکھنا پڑے، اس کی کاٹ چھانٹ کرنا پڑے، وہ صنف بلوچی ادب کی اپنی نہیں ہے۔ چونکہ بلوچی ابھی حال ہی میں تحریر کی زبان بنی ہے (یعنی بیسویں صدی میں)۔ لہذا غزل و نظم بھی بہت حالیہ اصناف ہیں۔ یوسف عزیز مگسی اور ان کے رفقاء اسی طرح درخانی کتبہ فکر کے ہمارے بزرگوں نے فارسی کی یہ صنفیں ہماری زبان میں شامل کر دیں"(2)۔

بلوچی نظم کی روایت کے بارے میں دیگر محققین کی رائے یہ ہے کہ بلوچی کلاسیکی شاعری بنیادی طور پر نظم ہی ہے۔ اکبر قشاداس کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"بلوچی نظم کے روایت کے بارے میں بات چیت ہو گی تو پھر بلوچی شاعری کی معلوم شدہ اور دستیاب ساڑھے پانچ سو سالہ ادبی تاریخ کو دیکھنے اور پرکھنے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ نظم بلوچی شاعری کا بنیادی سرچشمہ ہے۔ جو لوک ادب سے قدیم شاعری کے ذریعے سفر کرتی ہوئی آرہی ہے۔ نظم ابتدائی بلوچی شاعری کی بنیاد رہی ہے۔ بلوچی نظم بلوچی شاعری تیکنیک کی قدرتی مظہر ہے۔ وہ اپنے ہیئت کے اعتبار سے بڑی حد تک آزاد ہیئت کی مالک ہے۔ یہ اُردو کے آزاد نظم کے بجائے اوستا کے "گاتھا" اور سنسکرت کے "چھند" کے ساتھ قربت رکھتی ہے"(3)۔

بلوچی نظم کے ارتقاء کے بارے میں بلوچی زبان کے نامور محقق۔ ادیب اور دانشور ڈاکٹر واحد بخش بزدار یوں رقمطراز ہیں۔

"بلوچی شاعری کی پانچ سو سالہ ادبی تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بلوچی شاعری کی روایت "نظم" کی شاعری ہے۔ جو لوک ادب سے لے کر کلاسیکی شاعری تک اس کے خمیر میں رچی بسی نظر آتی ہے۔۔۔ بلوچی عروض پارسیوں کی دینی کتاب "اوستا" کے منظوم گاتھاؤں اور سنسکرت کے "چھند" سے ملتا جلتا ہے جو کہ رگ وید میں مستعمل ہیں۔ سب سے قدیم شعر صرف ارکان پر مبنی ہے۔ لیکن بعد میں مخصوص اصناف سخن کے لئے مخصوص حدود مقرر کر دی گئی ہیں۔ ان کا بھی اگر فنی تجزیہ کیا جائے تو ماتراؤں کے گھٹانے اور بڑھانے کا رجحان ملے گا۔ گو کہ عہد حاضر میں قدیم بحور کا استعمال ترک کر دیا گیا ہے اور تمام تر شاعری میں وہی بحریں اوزان اختیار کئے جا رہے ہیں جو فارسی اور اُردو شاعری میں مستعمل ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ چاکری دور کی بلوچی شاعری میں "اوستا" کے گاتھاؤں اور سنسکرت کے "چھند" کے طرح کی نظم کے ساتھ

ساتھ پابند نظم کی روایت بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ لیکن اٹھارہویں صدی کی بلوچی شاعری میں پابند نظم کا عمل دخل کچھ زیادہ ہی نمایاں ہے۔ جبکہ اس سے قبل سترہویں صدی میں "ملائی دور" کی شاعری میں قدیم بلوچی عروض کے ساتھ ساتھ عربی عروض کا استعمال بھی دیکھنے کو ملتا ہے(4)۔

بلوچی شاعری میں حانی وشہ مرید، شہداد و مہناز، دوستین و شیرین، حمل، جیئند، لعل و گراناز، عزت و میرک، سسی پنوں، شیرین فرہاد جیسے داستانیں بھی ہمیں نظمیہ انداز میں ملتی ہیں۔ چاکر رند، میر گوہرام لاشاری، بالاچ، بیورغ، ریحان، جاڑو، وغیرہ کی شاعری بھی نظم شکل میں موجود ہیں۔ رند و لاشار کی تیس سالہ جنگ کی کہانی، بالاچ بیر گیر کی اپنے بھائی، دودا کا بدلہ لینے کی داستان بھی نظم کی شکل میں موجود ہے۔ اسی طرح ابتدائی دور کے شعراء کی شاعری یہ واضح کرتی ہیں۔ بلوچی زبان میں نظم کی روایت فارسی زبان، اردو زبان سے پہلے موجود تھی۔

نظم جسے بلوچی میں "لچہ" اور "شاعری" کہا جاتا ہے شاعر کو "شاعر" یا "لچہ کار"۔ نظم کی جڑیں بلوچی شاعری کے ابتدائی دور میں پیوست نظر آتی ہیں۔ کیونکہ شعری روایت نظم کی شاعری ہے جو ہمیں لوک ادب سے لے کر کلاسیکی شاعری کے رنگوں میں قوس قزح بن کر نظر آتی ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ شروع دن سے بلوچی شاعری کی بنیاد اور منبع نظم ہے تو غلط نہیں ہوگا اور موجودہ بلوچی نظم اور آزاد نظم کلاسیکی بلوچی شاعری کی تکنیک کے ارتقا کی مظہر ہے جو اپنی ہیئت کے اعتبار سے بہت حد تک آزاد ہیئت کا حامل ہے۔ لیکن یہ اردو نظم کے برعکس پارسیوں کی دینی کتاب "اوستا" کے منظوم گاتھاؤں اور سنسکرت کے "چھند" سے ملتا جلتا ہے۔ جو رگ وید میں مستعمل ہیں۔

بلوچی ادب کے دستیاب خزانے کے ابتدائی دور یعنی میر چاکر خان رند کے عہد کی بلوچی شاعری میں "اوستا" کے گاتھاؤں اور سنسکرت کے "چھند" کی طرح نظم کے ساتھ ساتھ پابند نظم کی روایت بھی دیکھنے میں آتی ہے، لیکن اٹھارہویں صدی کے بعد بلوچی شاعری میں پابند نظم کا عمل دخل کچھ زیادہ ہی نمایاں ہے جبکہ اس سے قبل سترہویں صدی میں بلوچی شاعری میں قدیم بلوچی عروض کے ساتھ ساتھ عربی عروض کا استعمال بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

بلوچی نظم میں بلوچ شعراء نے اپنی شاعری میں زندگی کے تمام پہلوؤں کو سمویا ہے۔ ان کے الفاظ لوگوں کے دلوں کے ساتھ دھڑکتے نظر آتے ہیں۔ بلوچی نظم میں ایک طرف پوری

کائنات، اس کی وسعتوں اور پوری انسانیت کی بات کی جاتی ہے۔ تو دوسری طرف اپنے وطن واہلِ وطن کے دکھ، درد، خوشی، زیادتیوں اور محرومیوں کی آواز نظر آتی ہے۔ تاہم محدود معلومات کی بنا پر لاتعداد نئے اور پرانے شعرا کا ذکر نہیں ہو سکا ہوگا تاہم قارئین کو نظر ایک خاکے کی شکل میں امید افزا معلومات ضرور فراہم کی گئی ہیں۔

حوالہ جات:

1۔ سید ظہور شاہ ہاشمی۔1986۔ بلوچی زبان و ادب کی تاریخ۔ سید ہاشمی اکیڈمی کراچی۔ ص۔70

2۔ شاہ محمد مری، ڈاکٹر۔2009۔ مختصر تاریخ زبان و ادب بلوچی۔ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد۔ ص۔64

3۔ اکبر فشاد۔2017۔ بلوچی نوکیں نظم۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ ص۔32

4۔ واحد بزدار۔2005۔ جدید بلوچی شاعری کا آغاز و ارتقا۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔
ص۔61_63

5۔ صبا دشتیاری۔2003۔ بلوچی زبان دلبرانک۔1۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

6۔ صبا دشتیاری۔2007۔ بلوچی زبان دلبرانک۔2۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

7۔ صبا دشتیاری۔2009۔ بلوچی زبان دلبرانک۔3۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

جدید نظم

جدید نظم کو بلوچی میں "نوکیں لچہ" کہا جاتا ہے۔ جس کی بنیاد بیسویں صدی میں دکھائی دیتی ہے۔ جس کے بارے میں محققین کے خیالات یوں ہیں۔

"شاعری کی اکثر شکل صنف نہیں کہلاتی بلکہ وہ شاعری کی ہیئت کہلاتی ہے کیونکہ وہ صرف اپنے ظاہری رنگ وروپ کے ذریعے پہنچائی جاتی ہے۔ یہ ظاہری رنگ وروپ متعدد اصناف میں استعمال ہوتے ہیں۔ جیساکہ مرثیہ، شہرآشوب، واسوخت، نظم اور گیت اردو شاعری کے وہ اصناف ہیں جنہیں الگ شناخت نہیں کیا جاتا بلکہ یہ مختلف طریقوں سے لکھے جاتے ہیں۔ جیساکہ بلوچی میں نزوک (خاص نظم) سوت (گیت) ایسے شکلی اشکال ہیں کہ ان کو نہ کسی خاص رنگ کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی مقصد کی۔ یہ شکلی طور پر اپنے پامزاج کے مطابق صنف کے مطابق ظاہر ہیں" (1)۔

بلوچی ادب میں جدید نظم کی بنیاد بھی ہمیں بیسویں صدی میں ہی نظر آتی ہے۔ قیام پاکستان سے چند سال قبل جب انگریزوں کے ظلم وجبر سے پورے ہندوستان میں سیاسی تحریکیں زوروں پر تھیں۔ بلوچستان یعنی سابق ریاست قلات میں انگریزوں کے پروردہ وزیر اعظم سرشس شاہ کی فلتیں عروج پر پہنچیں اور سیاسی تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ یہاں پر جاری ظلمتوں کی داستانیں "فریاد بلوچستان" کے نام سے لاہور کے اخبار میں چھپنے لگیں۔ مختلف سیاسی پارٹیاں بنیں۔ اس دوران میر گل خان نصیر جیسے نامور سخن ور سیاسی تحریک کا حصہ بنے جو شاعری کے میدان میں زورآزمائی کرتے نظر آتے ہیں۔ اکبر نشاد لکھتے ہیں۔

"بلوچی جدید نظم منظم انداز باقاعدہ آغاز اس وقت نظر آتا ہے۔ جب 1951 میں میر گل خان نصیر کے نظموں کا پہلا مجموعہ "گلبانگ" شائع ہوتا ہے کہ اس میں بلوچی ابتدائی جدید

نظمیں شامل ہیں۔ کلیاتِ میں میر نصیر کے 1942 سے لے کر 1951 تو سالوں کی شاعری موجود ہے۔ یہ ان کی فکر میں پختگی اور ان کے خیالات کو واضح کرتے ہیں"(2)۔

بلوچی کی جدید نظم کی آبیاری کرنے والوں میں میر گل خان نصیر، مراد آوارانی، میر عیسیٰ قومی، محمد حسین عنقا، اسحاق شمیم، آدم حقانی، جمعہ کلانچی، حکیم خدائے رحیم، ملا اسماعیل پلی آبادی، نصیر خارانی (کبدانی)، قاضی عبدالرحیم صابر، میر آحمد دہانی، میر محمود خان گچکی، مولوی محمد حسین عاجز، ملک سعید دہوار، بیرل زہیرانی، نور محمد ہمدم، شوکت ندیم، کریم دشتی، انور شاہ قیطانی، عبدالحکیم حقگو، آزات جمالدینی، مری خان لیزنی، ملک محمد رمضان، عبدالرحمٰن غور، سید ظہور شاہ ہاشمی، اکبر بارکزئی، عطا شاد، اشرف سربازی، ہاشم شاکر، دوست محمد بیکس، عنایت اللہ قومی، میتگل خان لری، صدیق آزات وغیرہ شامل ہیں۔ یہ قافلہ بڑھتا جاتا ہے اور اس میں غوث بہار، غنی پرواز، ڈاکٹر فضل خالق، پروفیسر صبا دشتیاری، اللہ بخش بزدار، بشیر بیدار، مبارک قاضی، ابراہیم عابد، ڈاکٹر علی دوست، اے آر داد، عبید شاد، ممتاز یوسف، بیرل شے مگری، باقر علی شاکر، قیوم قاصد، چراگ لاشاری، رزاق نادر، منیر مومن، منظور بسمل، زبیر مختار، اسلم ابرار، جہانزیب گوکی، فقیر شاد، نصیر احمد علیم، ضامن مراد، نصیر احمد فقیر، رشید لال، دُرجان محب، ابراہیم وانگ، اللہ بخش دشتی، عزیز پیشکانی و دیگر لاتعداد نوجوان شعراِ اکرام کا نام آتا ہے۔

آزات جمالدینی، میر محمد حسین عنقا، کریم دشتی، اشرف سربازی، عطا شاد، صدیق آزات، ملک محمد طوقی، اکبر بارکزئی، ہاشم شاکر نے بھی آزاد نظم کو متعارف کر کے اسے جدید اور توانا بنیادیں فراہم کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ان شعرا کی جد وجہد کی بدولت ساٹھ کی دہائی کے آخری سالوں میں آزاد نظم نئے اسلوب اور نئے رویوں میں ڈھل گئی۔ عطا شاد کی آواز اپنے عہد کی آوازوں میں سب سے زیادہ نمایاں اور منفرد رہ کر جدید بلوچی شاعری میں نئے رجحانات کی موجب بنی۔ ان کی بدولت بلوچی شاعری مجموعی طور پر ایک ہی وقت میں قومی اور بین الاقوامی طرزِ احساس کی شاعری بنی۔ وطن اور قوم سے اپنی محبت کے سانچے کو پوری انسانیت سے محبت کا محور بنائیں تو شاعری کا جذبہ جنم لیتا ہے۔ بلوچ شعرا کے نزدیک انسانیت کا عالمگیر تصور قومیتوں کے وجود، ان کی زبان اور تاریخ و تہذیب کی نفی کرنے سے

نہیں بلکہ قومیتوں کے باہمی اشتراک اور احترام سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے یہاں اپنی زبان، تاریخ، تہذیب اور ثقافت کے بعد دریافت کا عمل ایک جزو کے طور پر کل میں ڈھلتا ہوا نظر آتا ہے۔

حوالہ جات:

1۔ اکبر فشار۔ 2017۔ بلوچی نوکین نظم۔ بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ۔ ص۔ 57

2۔ اکبر فشار۔ 2017۔ بلوچی نوکین نظم۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ ص۔ 131

3۔ صبا دشتیاری۔ 2003۔ بلوچی زبان و ادب اتک۔ 1۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

4۔ صبا دشتیاری۔ 2007۔ بلوچی زبان و ادب اتک۔ 2۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

5۔ صبا دشتیاری۔ 2009۔ بلوچی زبان و ادب اتک۔ 3۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

غزل

غزل کو بلوچی میں "دستونک" کہتے ہیں۔ اور غزل لکھنے والے کو "شاعر" کہتے ہیں۔ غزل کے لغوی معنی عورت سے بات چیت، محبوب سے عشق کا ذکر یا وہ اشعار جن میں ہجر و وصال، حسن و جمال، عشق و محبت کا ذکر ہے۔ غزل بے حد لچک دار صنف سخن ہے اور ہر قسم کے موضوعات کو اپنے دامن میں حسن و لطافت سے سمیٹنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ عشق غزل کا اہم موضوع ہے اور یہ اسے عمودی اور افقی دونوں سمتوں میں لکھنے میں معاونت کرتا ہے۔ غزل کا معشوق گوشت و پوست کا پیکر بھی ہے اور اس کی حیثیت علامتی بھی ہے۔ لیکن اس کی صفات عمومی ہیں اور یہ حقیقت کے علاوہ مجاز کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔ غزل میں تصوف کا موضوع اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کرتا ہے جو بندہ و خدا کے درمیان موجود ہے۔ بلوچی شاعری کی پانچ سو سالہ دستیاب ادبی تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غزل کی روایت بلوچی شاعری کی قدیم کلاسک میں موجود نہ تھی۔

بلوچی ادب میں یہ صنف متعارف کرانے کا سہرا ملنگ شاہ ہاشمی کے سر جاتا ہے جنہوں نے بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے آغاز یعنی 1922 میں غزل میں غیر شعوری طبع آزمائی کی۔ دیگر لاتعداد ادبی سرمایہ کی طرح ملنگ شاہ ہاشمی کی شاعری کا بیشتر حصہ محفوظ نہ ہونے کے باعث امتداد زمانہ کی نذر ہونے کی وجہ سے ہمارے ہاتھ نہ آ سکا۔ روایتی غزل میں یہ عشق، حسن، محبوب کی کافر ادائیں، دلکش رعنائیوں، ہجر کی تلخیوں اور وصال کی لذت کے گرد شاعری سے احساس کا ہالہ بنا گیا۔ کبھی یہ ماورائی جذبے کے طور پر ایک مبہم روحانیت کے تصور میں ڈھلتا رہا لیکن سماجی کشمکش اور زندگی کی شکست و ریخت کے مراحل سے متاثر ہوتے ہوئے غزل کے عشقیہ موضوعات میں وسعت آگئی۔ جس سے محبوب کے تصور اور خد و خال میں توسیع ہوئی۔ یوں تصور گوشت

پوست کے پیکر سے آگے بڑھ کر ادب برائے زندگی، معاون ترقی، جبر و استحصال کے خلاف صف آرا اور انسان کا ترجمان بنا۔ اس اسلوب نے ہیئت اور موضوع کی تخلیقی جدت کے مراحل طے کرتے ہوئے لیلائے وطن کا روپ دھارا۔ پھر اسی تصور میں وسعت آئی تو شاعری بہتر، روشن، پر امن اور خوشحال معاشرے کی قیام کے خواہش میں ڈھل گئی۔ بلوچ غزل گو شاعر انسان سے انسان دوستی کا طلب گار نظر آتا ہے اور اس کی دوستی کی بنیاد بھی انسان دوستی ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ بلوچی زبان کی ابتدائی شاعری میں بھی یہ خوبیاں واضح طور پر موجود ہیں ابتدائی شاعر بھی اپنے ماحول، سماج، ظلم جبر سے ناآشنا نظر نہیں آتا ہے۔

پانچویں کی دہائی میں بلوچی شاعری میں غزل صنف نے اپنی جڑیں کامیابی سے مضبوط کر کے تناور درخت بننے کا آغاز کیا۔ بلوچی غزل کے ابتدائی دور میں فارسی کی روایتی تشبیہات و استعارات و تلمیحات کے استعمال سمیت فکر و فن و خیال میں سطحیت اور یکسانیت نمایاں ہے۔ مگر وقت و حالات کی تبدیلی کی وجہ سے بعد میں صورت حال اس سے مختلف نظر آتی ہے۔ پھر وطن پرستی اور قوم دوستی کے حوالے سے نیا فکری رویہ پہنچتا ہے۔ جس کی وجہ سے غزل کا رخ روایتی موضوعات کے برعکس نئے تقاضوں اور جدید فکر کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ بہت سے شعرا خود کو فارسی اور اردو کے حصار سے نکال کر نہ صرف جداگانہ بلوچی لہجہ اختیار کرتے ہیں بلکہ فکری سطح پر ماورائی جذبے سے دامن چھڑا کر عصری مسائل کے اظہار کو اپنے فن کا وسیلہ بناتے ہیں۔

بلوچی غزل میں ابتدائی طور پر یعنی پانچویں و چھٹی دہائی سے جن نامور سخن وروں نے طبع آزمائی کی ان میں آزات جمالدینی، محمد حسین عنقا، کریم دشتی، میر گل خان نصیر، سید ظہور شاہ ہاشمی، آسکو جمالدینی، لعل بخش آزات، عابد آسکانی، اکبر بارکزئی، محمد اسحٰق ساجد بزدار، بروتی بلوچ، محمد امین بلوچ، غوث بہار، حکیم خدائے رحیم بیتاب، محمد اسماعیل بہشتی، بیگ محمد بیگل، جی آر ملا، ظفر علی ظفر، فقیر محمد عنبر، نجمہ شمشاد، اسماعیل بلوش، دوست محمد، ملک طوقی، محمد توفیق، احمد جگر، آدم حقانی، عبدالحکیم بگٹی، پیر محمد زبیرانی، سید عیسیٰ نوری، احمد زہیر، ممتاز سرپرہی، عطا شاد، قاضی عبدالرحیم صابر، محمد عثمان غریب، غنی غریب، غلام محمد الدین میجار، الٰہی بخش فدا، انور شاہ قیطانی، عنایت اللہ قومی، علی اکبر لال، ملک محمد رمضان، کوزاخان مری، گل محمد وفا، صدیق آزاد، واجہ اللہ بخش الجوہر، محمود خان موسمن بزدار، غنی پرواز، بابل دشتیاری، نبی داد زہیرانی، عباس علی زیگی،

اشرف سربازی، نصیر شاہین، غوث بخش صابر، اسماعیل ممتاز، نسیم الفت وغیرہ شامل ہیں۔ پھر ساتویں دہائی میں اس کارواں میں اکرم صاحب خان، انور صاحب خان، محمد عثمان صبا، ابراہیم عابد، عبدالرحمٰن غور، قاضی مبارک، مٹھا خان مری، ستار میاد، عبدالمجید گوہری، یار محمد یار، چاکر علی ابرار، انور شادمان ساجدی، پیر محمد پیرل، غلام فاروق بلوچ، بز بلوچ، تاج محمد تاجل، غفار ندیم پیشکانی، رزاق نادر، ڈاکٹر فضل خالق، غلام حسین شوہاز، منظور جمالی، چراگ شادی، مولا بخش مشتاق و دیگر سینکڑوں شامل ہیں۔ بعد ازاں بھی قافلہ رواں دواں رہتا ہے۔ صیاد شتیاری، یار محمد حاکم، برکت علی سجاد، باقر علی شاکر، شمس الدین شمس، شہزاد بشیر، بجبر مجید، انور صدیق، امیر حبیب اللہ، واحد بزدار، کریم بلوچ، امام بخش بہار، بیدل بخشی، اکبر پرواہ، رحیم پروانہ، منیر مومن، غنی پہوال، ایم ایچ خلیل آہسری، یوسف رضا آہسری، محمد کریم آزاد، محمد یاسین آزاد، اسلم آزاد، غلام حسین آزاد، رشید مومن، صادق مراد، یوسف عزیز مگسی، یٰسین مجروح، حمید وگل، زینت ثناء مختیار زہیر، تاج محمد طائر، اصغر علی آزگ، رحمان عارف، ڈاکٹر علی دوست، عطاء اللہ آزگ، اسلم ابرار، خالد ارس، حفیظ ارمان، بزگ مراد، شاہد ارمان، خلیل احمد بازل، یونس ارمان، بزگ مراد، نصیر بزگ، عیسیٰ کوشتاقی، نور خان بزنجو، طاہر احساس جتک، معتز یوسف، رشید بلوچ، عبید شاد، حفیظ حسن آبادی، نصیر بلوچ پیدارکی، اے آر داد، غفار پرویز پاسنوی، اصغر مہر، خدا بخش جاوید، شہداد چاہسری، کہدہ علی، ناصر کوشتاقی، نور شنگیں، محمد افضل راہی، حمل خان، جوش گنگوری، واحد بخش راہی، کریم رضا، امیر علی زعمرانی، طارق سخی، ساجد ضامن و دیگر لاتعداد اس سفر کے راہی ہے۔ اسی طرح نوے کی دہائی سے اب تک محمد حسین آزاد، آدم ابراہیم، منظور بسمل، شریف ابراہیم، امام ارمان، امین ارمان، عبدالرحیم ارمان، اکبر علی اکبر، یاسین بسمل، اکرم اقرار، ندیم اکرم، لیاقت امین، مقبول انور، محسن بالاچ، جلیل بسمل، تاج ابراہیم، خالد تگرانی، خلیل تگرانی، ریاست جاہد، انور جمالی، حاجی بیز، حمل غنی، اسحاق خاموش، اعجاز ذاکر، نسیم راہی، انور رضا، سہیل رضا، ستار سخی، محمد سلیمان اکمل شاکر، وہاب شوہاز، بیزن صبا، یعقوب عادل، مومن معراج، سید سیاد نوری سمیت سینکڑوں شامل ہیں۔ اگر ہم سب شاعروں کی بات کریں گے تو ان کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ یہ وہ شعراء ہیں جن کی شاعری مختلف اخبارات، رسائل، جرائد وغیرہ میں چھپ چکے ہیں۔

ابتدائی ایام سے ساتویں دہائی تک بلوچی غزل میں نمایاں شعراء میں آزات جمالدینی

، سید ظہور شاہ ہاشمی، کریم دشتی، مراد ساحر، میر گل خان نصیر، محمد حسین عنقا، عطا شاد، جی آر ملا
، ظفر علی ظفر، بشیر بیدار، الفت نسیم، ابراہیم عابد، مومن بزدار، بابل دشتیاری، غوث بخش
صابر، اسماعیل ممتاز، پیر محمد زبیرل، برکت اللہ بلوچ، غلام فاروق بلوچ، انور صاحب خان،
رزاق نادر، صوفی اسحق، عطا شاد، ساجد بزدار، غلام حسین شوہاز، اقبال راز، تاج محمد طاہر و دیگر
شعرا شامل ہیں۔

سید ظہور شاہ ہاشمی کو دستونک (یعنی غزل) کا معتبر شاعر کہا گیا ہے۔ سید ظہور شاہ ہاشمی
بلوچی زبان و ادب میں ایک نمایاں نام ہیں۔ وہ 21 اپریل 1926 کو گوادر میں پیدا ہوئے اور
ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم سید محمد شاہ ہاشمی سے حاصل کی۔ بعد میں گوادر سیکنڈری سکول میں
تعلیم حاصل کی۔ 1949 میں ریڈیو پاکستان کراچی میں بلوچی پروگراموں کے نگران نامزد
ہوئے۔ سید ہاشمی ایک نامور شاعر، محقق، تاریخ دان اور قلم کار رہے ہیں۔ سید ظہور شاہ ہاشمی 4
مارچ 1978 کو وفات پاگئے۔ جنہیں میوہ شاہ قبرستان کراچی میں دفن کیا گیا۔

مراد ساحر بلوچی غزل میں نمایاں نام ہے۔ ان کے پیدا ہونے کے ماہ و سال کے بارے
میں محققین خاموش ہیں۔ تاہم انہوں نے ابتدائی دینی تعلیم تگور تمران میں حاصل کی پھر کراچی
میں اپنے چچا کے ہاں پڑھنے کے لئے گئے، وہاں چھٹی جماعت تک تعلیم حاصل کی اور تمران آگئے۔
حالات نے ان کو مزید پڑھنے سے محروم رکھا تو اپنے والد کے کندھے سے کندھا ملا کر محنت و
مزدوری کرنے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے ایک مستری کے ہاں گاڑیوں کی مرمت کا کام شروع کیا اور
تھوڑی مدت میں کام سیکھ لیا۔ انہوں نے زندگی کے لئے بڑی جفاکشی برداشت کی۔ انہوں نے
بڑی جوان مردی کے ساتھ غربت، بھوک، وافلاس کے خلاف جدوجہد کی' اسی حالت میں بلوچی
ادب میں نمایاں مقام حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ عملی زندگی بھی عزت سے گزاری۔

مراد ساحر کا بلوچی زبان و ادب ان ابتدائی شاعروں میں شمار ہوتا ہے جن کو سدا
یاد رکھا جائے گا۔ ان کا مجموعہ کلام کلیات "جشن مستی پہ پاتاں" کے نام سے شائع ہوا۔ ان کی
شاعری حقیقت و سچائی سے بھری ہے۔ ان کی جفاکشی، معاشرے کے حالات، غربت، بھوک
افلاس کے خلاف برسرپیکار نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری معاشرے میں ظلم و ناانصافی کے
خلاف جدوجہد کی علامت ہے۔ انہوں نے روایتی تشبیہات، استعارات اور مستعارات اور

تقلیدی افکار کے برعکس بلوچی غزل کے حوالے سے نئی حقیقت پر مبنی زبان و الفاظ و تراکیب کے ذریعے احساسات و جذبات کے نئے رجحانات متعارف کرائے۔ وہ حریت آزادی اور سماجی عدل پر یقین کامل رکھتے تھے۔

میر گل خان نصیر جدید بلوچی شاعری کے میدان میں وہ شاعر ہیں، جنہوں نے بلوچی شاعری کو موضوع اور مواد کے اعتبار سے ایک نیا رنگ، نیا رخ اور نئی جہت عطا کی۔ میر گل خان نصیر 14 مئی سال 1914 نوشکی کے نزدیک گلی مینگل میں حبیب خان مینگل کے گھر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں پھر سنڈیمن ہائی سکول کوئٹہ اور اسلامیہ کالج لاہور سے مزید تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے شاعری کا آغاز 1934 میں بیس سال کی عمر سے کیا۔ انہوں نے بلوچی کے علاوہ براہوی، اردو اور فارسی زبان میں اشعار کہے۔ ان کی شائع ہونے والی کتب میں "گل گال، گل بانگ، گرند، شاہ لطیف گوشیت، شپ گروک، حمل و جیئند، دوستیں و شیرین، بیت بیکل، کوچ و بلوچ، بلوچستان قدیم و جدید تاریخ کی روشنی، بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی، سینائی کیچیک، بلوچی رزمیہ شاعری، بلوچستان کے سرحدی چھاپہ مار، بلوچی عشقیہ شاعری، تاریخ خوانین قلات، مشہد نامہ، تاریخ قلات" شامل ہیں۔ ان کی بلوچی شاعری کو بلوچی اکیڈمی نے ایک کلیات "تیر گال کاریت" کے نام سے شائع کیا۔

ان کی ابتدائی بلوچی شاعری ایک محدود نقطہ نظر اور مخصوص رویوں اور رجحانات کی حامل رہی بعد میں انہوں نے بلوچی شاعری کو موضوعاتی وسعت و فنی ریاضت دینے کے ساتھ ساتھ فکری بنیاد فراہم کی۔ انہوں نے بلوچ معاشرے میں موجود سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے بلوچ عوام میں اتحاد و اتفاق اور یکجہتی پیدا کرنے کے ساتھ حیرت انگیز طور پر طبقاتی شعور کی پختگی، قبائلی و سرداری نظام سے بغاوت، جرگہ شاہی، غربت، بھوک و افلاس کے خلاف عوام کو متحرک کرنے کے لئے شاعری کی۔

اکبر بارکزئی بلوچی شاعری کا ایک اور معتبر نام ہے۔ وہ 14 ستمبر 1939 میں شکارپور میں پیدا ہوئے تعلیم کراچی سے حاصل کیا۔ وہ بلوچی زبان کے ابتدائی خدمت گاروں میں سے ہیں۔ کراچی میں اپنے دوستوں لالا لعل بخش رند، یوسف نسکندی، سید محمد یار، مولانا خیر محمد ندوی، رحیم بخش آزاد، بیگ محمد بیگل وغیرہ کے ساتھ مل کر ادبی سرگرمیوں میں مصروف عمل رہے۔

اکبر بارکزئی فکری حوالے سے ان ادیبوں کے ہمراہ تھے جو بلوچ قوم کی استحصالی صورت حال کو تبدیل کرنے کے خواہش مند تھے۔ اکبر بارکزئی کی شاعری عوامی زندگی کی عکس نگاری ہے۔ ان کا عنوان محکوم طبقات، قبائلی تنگ نظری، پسماندگی، غربت، بھوک، افلاس رہی ہے۔ ان کی کتاب "روچ کئے کشت کنت" (سورج کو کون چھپا سکتا ہے) ان کی فکری تعلق کا عکس ہے۔ اس نے شاعری میں نئی راہیں متعین کیں۔ ان کی کوشش رہی ہے کہ وہ اپنی شاعری کے ذریعے شعوری تحریک کو آگے لے جائیں اور اپنے سخن سے لوگوں کو متحرک کریں۔

ملک محمد طوقی بھی بلوچی زبان کے ابتدائی شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ ملک طوقی 1936ء میں مکران میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مکران میں حاصل کی، پھر کراچی سے تعلیم حاصل کرنے چلے گئے۔ 1960 میں ریڈیو پاکستان کراچی سے بلوچی خبروں کے مترجم و نیوز ریڈر کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ 1964 میں پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ، وزارت انفارمیشن میں ریسرچ آفیسر بنے۔ 1978 تک ذمہ داریاں نبھائیں پھر ایران منتقل ہوئے۔ وہاں سے یورپ چلے گئے، مشی گن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی۔ وہیں درس و تدریس سے وابستہ ہوئے۔ اختر مینگل کی وزارت اعلیٰ کے دور میں وہ تعلیم و ثقافت کے مشیر رہے لیکن بعد میں مستقل ہو کر دوبارہ امریکہ چلے گئے۔

ڈاکٹر ملک طوقی کم عمری سے لکھنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ پڑھنے کے دوران ہی انہوں نے کالج میگزین کے ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ کچھ عرصہ ماہنامہ اومان کے نائب مدیر بھی رہے۔ انہوں نے بلوچی، اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں میں لاتعداد، شعر و دیگر تحاریر لکھیں جو چراغ راہ لاہور، جنگ کراچی، بلوچی دنیا ملتان، ندائے بلوچستان لندن، اومان کراچی، بلوچی کراچی، اولس کوئٹہ، لبزانک بلوچی کوئٹہ و دیگر اخبارات اور رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔

عطاشاد بلوچی شاعری کا وہ جگمگاتا ستارہ ہیں جن کو نہ صرف بلوچی بلکہ اردو شاعری میں معتبر حیثیت حاصل ہے۔ وہ سنگانی سر کیچ ضلع میں 1939 میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام محمد اسحق تھا۔ ان کا نام عطاشاد اس وقت رکھا گیا جب سکول میں داخل ہونے گئے تو محمد اسحق نام کے کئی دیگر بچے بھی تھے۔ تو ان کا نام تبدیل کر کے عطاشاد رکھا گیا۔ ان کے والد کا نام لعل خان تھا۔ ابتدائی تعلیم تربت، پنجگور سے حاصل کی، پھر کوئٹہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے آئے۔

انہوں نے شاعری کی ابتدا اسکول کے زمانے میں 1955 میں کی، آغاز اردو شاعری سے کیا بعد میں بلوچی شاعری کی طرف راغب ہوئے۔ ریڈیو پاکستان سے پروڈیوسر اور ڈرامہ نگار کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا پھر محکمہ اطلاعات و نشریات ڈھاکہ میں انفارمیشن آفیسر بنے۔ پھر ڈائریکٹر تعلقات عامہ بلوچستان، ڈائریکٹر ادارہ ثقافت بلوچستان، سیکریٹری اطلاعات و نشریات بلوچستان، سیکریٹری بینکات بلوچستان، ڈائریکٹر آثار قدیمہ بلوچستان، ڈائریکٹر جنرل آثار قدیمہ بلوچستان کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیئے۔ انہوں 34 سال گیارہ ماہ تک سرکاری اداروں میں مختلف عہدوں پر خدمات سرانجام دیں۔ انہوں نے 3 فروری 1997 کو وفات پائی اور ان کا مقبرہ کوئٹہ میں ہے۔ انہوں نے بلوچی ادب میں نمایاں کردار ادا کیا۔

بلوچی شاعری میں عطا شاد کا اسلوب بیان خارجی دباؤ کے باوجود دیگر سخن وروں سے منفرد رہا۔ ان کی بلوچی زبان کی غزلیں اور نظمیں فنی لحاظ سے ایک دوسرے سے علیحدہ اور مختلف مزاج کی حامل رہی ہیں۔ بلوچی غزل میں گھمبیر تا اور خوابناک احساسات کی فضا میں انسانی شعور، عام انسانی تجربات سے بلند کرتے ہوئے فکری تجرید میں ڈھالا اور دکھ کی گہرائیوں میں اتار کر اسے نیا وجود، نئی پہچان، نیا رنگ اور نئی جہت دینے کی کوشش کی۔ عطا شاد کی شاعری کا موضوع بلوچ اور بلوچستان نا گمیریت کے تناظر میں ہے۔ بلوچی شاعری میں کلاسیکل رنگ کا عکس نظر آتا ہے۔ تو اردو شاعری میں ان کی بلوچی الفاظ کو خوبصورت طریقے سے استعمال کرتے ہوئے اس میں نیا رنگ بھرتے ہیں۔ جہالت، فرسودہ نظام، قبائلی نظام کی اثرات بد اور گردش حالات کی چکی میں پسنے والے طبقے کے دکھ درد، رنج و الم کے کرب کو محسوس کرتے ہوئے وہ ناانصافی، ظلم، جبر، بھوک، افلاس اور استحصال کے خلاف شعوری جنگ کرتے ہیں۔

حوالہ جات:

1۔ صبا دشتیاری۔ 2003۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 1۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی
2۔ صبا دشتیاری۔ 2007۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 2۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی
3۔ صبا دشتیاری۔ 2009۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 3۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

حمد

حمد ایک عربی لفظ ہے، جس کے معنی "تعریف" کے ہیں۔ اللہ کی تعریف میں کہی جانے والی نظم کو حمد کہتے ہیں۔ حمد باری تعالیٰ، کئی زبانوں میں لکھی جاتی رہی ہے۔ یہ عربی، فارسی، کھوار اور اردو زبان میں اکثر دیکھی جاسکتی ہے۔ حمد کو انگریزی میں Hymn کہتے ہیں۔ ویسے رب کی تعریف ہر زبان میں اور ہر مذہب میں پائی جاتی ہے۔ حمد کے لئے بلوچی میں "ساڑا" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

قدیم بلوچی شاعری میں میر چاکر رند، میر شہداد، شہ مرید، بیورغ رند، جام درک، ابراہیم شنبانی، ننگران، توکلی مست، ملا قاسم رند، جوانسال بگٹی جیسے تمام نامی گرامی شعرا کرام کے شعر میں ابتدائی مصرعہ میں ہمیں مدح کی روایت ملتی ہے۔

مداح کی روایت چودھویں صدی سے شروع ہوتی ہے اور بیسویں صدی تک سفر کرتی ہے۔ بیورغ کے اشعار ہوں یا شہ مرید کے۔ جام درک کی شاعری ہو یا ملا فاضل کا کلام۔ توکلی مست کے گفتار ہوں یا جوانسال کی شاعری۔ سب نامی گرامی شعرا کے اشعار کے ابتدائی مصرعوں میں یہی روایت ملتی ہے (1)۔

بلوچی قدیم شاعری کے صنف جسے "شعر" کہا جاتا ہے۔ قدیم بلوچی شاعری جو ہمیں دستیاب ہوئی ہے وہ سولہویں صدی کے آخری ادوار یا ستر ہویں صدی کے ابتدائی دور کی شاعری ہے۔ اس دور کی شاعری میں خصوصیت یہ ہے کہ اس کا آغاز حمدیہ مصرعوں سے ہوتا تھا۔ ہر شعر کے ابتدا میں دو سے چار مصرعوں سے پروردگار کی ثنا موجود ہے۔ وسطی دور تک صورت حال ایسی ہی نظر آتی ہے۔ لیکن اب تک یہ ایک صنف کے شکل میں باقاعدہ طور پر آگے نہیں بڑھ رہی ہے۔ شعر کے ابتدا میں کچھ مصرعے حمد و ثنا کے کہے جاتے ہیں تاہم اس کی موجودگی کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بلوچی شاعری میں حمد پرانی صنف ہے۔ حمد کے بارے میں ایک بات

کیوں کہ یہ ایک پابند صنف ہے۔ کیونکہ شاعر یہاں پر ہر طرح سے احتیاط برتتا ہے کہ کہیں کوئی لفظ یا جملہ ایسا نہ نکلے جو ادب کی حدود پار کرے۔ میرے خیال ہے کہ یہی سبب دیگر اصناف کی طرح حمد کسی زبان میں جگہ نہیں لے پائی بلکہ نئے دور کے شعرا نے اس صنف کے ساتھ ناانصافی برتی ہے۔ شاعر پابندی کی سرحدوں کو توڑنے کی خواہشمند ہیں(2)۔

جب ہم بلوچی کلاسیکل شاعری کے دوسرے دور کا جائزہ لیتے ہیں تو اس میں ہمیں اکثر شعرا کرام اپنے اشعار کی ابتدا میں حمدیہ مصرعے شامل کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں ملا عبدالحمید روانبد، مولوی عبداللہ چشتینی، چگھا بزدار، مراد ساحر، مبارک قاضی، یٰسین بسمل، ابراہیم امیری، رزاق نادر، مولوی عبدالغنی، اخلاق حسین، اصغر محمود، یونس حیات، عقیل عاقل، غلیل بڈل، مراد شاکر کی شاعری میں حمد باقاعدہ طور پر ملتا ہے۔

حوالہ جات:

1۔ شیر عبدالقادر شاہوانی۔ 2001۔ بلوچی شاعری ءِ دروشم۔ بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ

2۔ صبا دشتیاری۔ 2015۔ گلکار پُلپکار۔ سید ہاشمی ریفرنس لائبریری کراچی۔ ص۔225

3۔ صبا دشتیاری۔ 2003۔ بلوچی زبان و لبزانک۔1۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

4۔ صبا دشتیاری۔ 2007۔ بلوچی زبان و لبزانک۔2۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

5۔ صبا دشتیاری۔ 2009۔ بلوچی زبان و لبزانک۔3۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

نعت

پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدحت، تعریف وتوصیف، شمائل وخصائص کے نظمی انداز بیاں کو نعت یا نعت خوانی یا نعت گوئی کہا جاتا ہے۔ عربی زبان میں نعت کے لیے لفظ "مدح رسول" استعمال ہوتا ہے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں بہت سے صحابہ کرام نے نعتیں لکھیں اور یہ سلسلہ آج تک جاری وساری ہے۔ نعت لکھنے والے کو نعت گو شاعر جبکہ نعت پڑھنے والے کو نعت خواں یا ثناء خواں کہا جاتا ہے۔ نعت کو بلوچی زبان میں "وزبت" کہا جاتا ہے۔

بلوچی شاعری میں حمد ایک الگ صنف کی طرح کبھی موجود نہیں رہی، نہ ہی نعت گوئی الگ صنف رہی ہے۔ مرثیہ بھی الگ شاخ کی صورت میں جڑ نہیں پھیلا سکا۔ بلکہ نعت وحمد ومرثیہ کے ایک آدھ مصرعے بلوچی ادبی داستان والی شاعری کی تینوں اصناف (یعنی عشقیہ یا رزمیہ یا مناظر فطرت) میں شامل کرتے ہیں (1)۔

بلوچی ادب میں شاعری کی ابتداء سے آج تک "وزبت" یعنی نعت الگ صنف کی حیثیت سے نظر نہیں آتی ہے۔ قدیم بلوچی شاعری میں حمد کے بعد نعت کے چار مصرعے ضرور ساتھ ہوتے تھے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں بلوچی میں نعت گوئی کی روایت موجود رہی ہے تاہم بلوچی شاعری میں باقاعدگی کے ساتھ نعت لکھنے والے شاعر کا اگر نام دیں تو وہ جوانسال بگٹی ہیں.......... جوانسال کے بعد حسین عاجز اور قاضی عبدالرحیم صابر نے اس صنف کو ترقی دی۔ ان دونوں شاعروں کے نعت گوئی کے مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں۔ جس میں حسین عاجز کے مجموعے کا نام "کلام عاجز" ہے جو کہ حمد ونعت کا مجموعہ ہے اور صابر صاحب کا مجموعہ "ساقیء کوثر" نعتیہ شاعری کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ مومن بزدار اور پیر محمد زبیرانی نے بھی بلوچی زبان میں نعت گوئی کی ہے (2)۔

بلوچی نعت گوئی کے متعلق اثیر عبدالقادر شاہوانی لکھتے ہیں کہ پیغمبر آخر زمان حضرت

محمد ﷺ کی تعریف اور توصیف کے لئے شاعری کی صنف نعت اسلامی ادب میں مروج و موجود ہے۔ ہر مسلمان کا پختہ ایمان اور عقیدہ ہے کہ سرور کائنات ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر اور حبیب ہیں۔ آپ ﷺ کے لئے دل میں محبت رکھنا اور ان سے عقیدت رکھنا ایک مسلمان کا فطری اور شعوری خاصہ ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو ان کو بحیثیت مسلمان ایک منفرد اور اعلیٰ مقام سے مشرف کرتا ہے۔۔۔۔۔۔ شاعر اپنی محبت و عقیدت کے جذبات کا اظہار انتہائی خو بصورت الفاظ و اشعار کی مالا میں پرو کر پیش کرتا ہے۔ حُبِ رسولؐ کے قلبی جذبات سے بلوچی شاعری بھی مالا مال ہے۔ بلوچی کے قدیم اور درمیانی دور کے شعراء اپنی منظومات کی ابتداء حمد باری تعالیٰ سے کرتے ہوئے ایک دو شعروں کے بعد حضور پاک سرور کائنات ﷺ کی نعت کی جانب رجوع کرتے تھے لیکن موجودہ دور میں مکمل طور پر نعت گو شاعر موجود ہیں۔ جو اپنے طور پر نعت گوئی کا حق ادا کر رہے ہیں(3)۔

اس فہرست میں کلاسیکل دور کے ملا فاضل رند، ملا قاسم رند، مولوی حضور بخش جتوئی، جو انسال بگٹی، ملا ابراہیم آگے چل اس میں میر گل خان نصیر، عطا شاد، قاضی عبدالرحیم صابر، میر مٹھے خان قومی، عبدالواحد آزاد جمالدینی، ملک محمد رمضان بلوچ، حکیم خدائے رحیم، محمد اسحاق بزدار، اثیر عبدالقادر شاہوانی، غوث بخش صابر، یٰسین بسمل، بابل و شتیزی، مبارک قاضی، حاجی فقیر محمد عنبر، ابراہیم عابد، زاہدور عیسیٰ رازی، یعقوب شکیل، بابل ہمراز، ہمراز بلوچستانی، نصیر سرکوہی، گوہر بلوچ، مجید مستاگ وغیرہ شامل ہوئے۔

حوالہ جات:

1۔ شاہ محمد مری، ڈاکٹر۔2014۔ بلوچی زبان و ادب۔ گوشہ ادب کوئٹہ۔

ص۔133

2۔ صبا دشتیاری۔2015۔ گلکار نچکار۔ سید ریفرنس لائبریری کراچی۔

ص۔233

3۔ اثیر عبدالقادر شاہوانی۔ روزنامہ جنگ۔ کوئٹہ

4۔ صبا دشتیاری۔2003۔ بلوچی زبان و لبزانک۔1۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

5۔ صبا دشتیاری۔2007۔ بلوچی زبان و لبزانک۔2۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

6۔ صبا دشتیاری۔2009۔ بلوچی زبان و لبزانک۔3۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

سلام

یہ نظم کی ایک قسم ہے جو زیادہ تر شہدائے کربلا کے مدح میں لکھی جاتی ہے۔ مرثیہ کی ایک ذیلی صنف جو ہیئتِ بحر اور تعدادِ اشعار کے لحاظ سے غزل کا سا انداز رکھتی ہے۔ واقعہ کربلا کے حوالے سے امام حسینؑ، ان کے اقارب اور رفقا کی شان اور ان کیفیت کو محسوس کر کے اس کو غزل یا قصیدے کے شکل میں پیش کرنے کو "سلام" کہا جاتا ہے۔

بلوچی شاعری میں اس صنف کا کوئی خاص تجربہ نہیں ہوا ہے لیکن بعد میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں کے باعث کبھی کبھی ایسے شاعر نظر آتے ہیں جنہوں نے سلام لکھے ہیں۔ مجھے رزاق نادر اور ڈاکٹر فضل خالق کے سلام اچھے لگے جو کہ روایتی نہیں ہیں بلکہ ان میں زندہ اور مکمل تخلیقی عمل کے نشان نظر آتے ہیں۔ جس میں امام حسینؑ کے بارے میں بہت سے خیالات دکھائی دیتے ہیں(1)۔

ویسے اُردو ادب میں کربلا..... علامت کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ہمیں اسی علامت کا رنگ رزاق نادر اور فضل خالق کی شاعری میں نظر آتی ہے۔

حوالہ جات:

1۔ صبا دشتیاری۔ گلکار و چاکار۔ 2015۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی۔
ص۔ 242

2۔ صبا دشتیاری۔ 2003۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 1۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

3۔ صبا دشتیاری۔ 2007۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 2۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

4۔ صبا دشتیاری۔ 2009۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 3۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

دوگال

دوگال کو بلوچی شاعری کی قدیم ترین صنف کہا جاتا ہے۔ گال بلوچی میں "لفظ" کو کہتے ہیں جس سے مراد، منہ سے نکلا ہوا کلمہ، سخن، گفتگو، بات، کلام ہے۔ بلوچی زبان کی نظم کے ہر مصرعے کو گال کہتے ہیں یہاں دوگال سے مراد دو مصرعے میں مدعا بیان کرنا۔

پرانے شعری ادب میں یہ "دوگال" کی صنف شاید بلوچی شاعری میں ابتدائی قدم ہے۔ کیونکہ اس میں صرف دو مصرعوں ہی میں مطلب کی تکمیل ہو جاتی ہے اور اس میں اغلب توصیف کا پلہ بھاری اور تشبیہ عام ہے(1)۔

بلوچی زبان کے قدیم شاعری کی غالباً سب سے قدیم ترین صنف "دوگال" ہے۔ اس میں دو مصرعوں میں مطلب کا اظہار ہوتا ہے۔ اسکالروں کا خیال ہے کہ اگر وقت نظر سے کام لیا جائے تو یہی "دوگال" غزل کی ابتدائی شکل کہی جا سکتی ہے۔ جس میں ہر دو مصرعہ اپنی علیحدہ اور آزاد حیثیت کے باوجود تکمیل مقصد کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ اسی طرح "دوگال" میں بھی یہ اوصاف موجود ہیں۔ یہ دوگال مختلف مواقع پر مختلف طرز موسیقی یا قتا میں استعمال ہوتے ہیں۔ اور اسی "دوگال" کے لوک موسیقی اور لوک شاعری میں استعمال نے سوت، نازینک، زہیرگ، لیلاڑی، ڈیہی کو جنم دیا(2)۔

یہ "دوگال" مختلف مواقع پر مختلف طرز موسیقی یا قتا میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً ان مصروں کو "سوت"، "نازینک" یا "زہیرگ" میں آزادی سے استعمال کیا جاتا ہے۔ البتہ یہاں زہیرگ سے زہیرگ کی اس قسم سے مراد نہیں جسے بلوچی کلاسیکی گوئیے پیش کرتے ہیں۔ بلکہ یہ ایک خاص چیز ہے جس میں رقت آمیز لہجے اور سُر میں یہ مصرعے گائے جاتے ہیں اور اکثر اس میں کسی سازینہ کی ضرورت بھی نہیں ہوتی(3)۔

مثلاً

تو شزدو دیر کت۔ زہیراں منال کور کت

یعنی

آپ نے بہت دیر کر دی۔ یادوں نے آنکھ بے نور کر دیے۔

حوالہ جات:

1۔ سید ظہور شاہ ہاشمی۔1986۔بلوچی زبان و ادب کی تاریخ۔سید ہاشمی اکیڈمی کراچی۔ص۔96

2۔ غوث بخش صابر۔1997۔بلوچی زبان و ادب کی مختصر تاریخ۔مقتدرہ قومی زبان۔اسلام آباد۔ص۔13-14

3۔ سید ظہور شاہ ہاشمی۔1986۔بلوچی زبان و ادب کی تاریخ۔سید ہاشمی اکیڈمی کراچی۔ص۔97

4۔ صبا دشتیاری۔2003۔بلوچی زبان و لبزرانک۔1۔سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ۔کراچی

5۔ صبا دشتیاری۔2007۔بلوچی زبان و لبزرانک۔2۔سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ۔کراچی

6۔ صبا دشتیاری۔2009۔بلوچی زبان و لبزرانک۔3۔سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ۔کراچی

رباعی

رباعی عربی کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی چار چار کے ہیں۔ شاعرانہ مضمون میں رباعی اس صنف کا نام ہے جس میں چار مصرعوں میں ایک مکمل مضمون ادا کیا جاتا ہے۔ رباعی کا وزن مخصوص ہے، پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے میں قافیہ لانا ضروری ہے۔ تیسرے مصرعے میں اگر قافیہ لایا جائے تو کوئی عیب نہیں۔ اس کے موضوعات مقرر نہیں۔ اردو فارسی کے شعرا نے ہر نوع کے خیال کو اس میں سمویا ہے۔ رباعی کے آخری دو مصرعوں خاص کر چوتھے مصرع پر ساری رباعی کا حسن و اثر اور زور کا انحصار ہے۔ چنانچہ علمائے ادب اور فصحائے سخن نے ان امور کو ضروری قرار دیا ہے۔ بعض نے رباعی کے لیے چند معنوی و لفظی خصوصیات کو بھی لازم گردانا ہے۔ عروض کی مختلف کتابوں میں رباعی کے مختلف نام ہیں۔ رباعی، ترانہ اور دو بیتی بعض نے چہار مصرعی، جنفتی اور خصی بھی لکھا ہے۔ رباعی کو بلوچی زبان میں "چار بند" کہتے ہیں۔

رباعی ایک اہم صنف شاعری ہے جو عام طور پر فلسفیانہ، اخلاقی، فکری اور کبھی کبھی عشقیہ مضامین پہ مبنی ہوتی ہے۔ عشق و محبت، اخلاص و تصوف، دین و دانش، حمد و نعت، پند و نصیحت، ذاتی خیالات، مدح و قدح، بادہ و ساغر، نوحہ و ماتم، سیاست و معاشرت، محبوب کا سراپا اور مناظر فطرت ان رباعیوں کے تمام موضوعات ہیں۔ بلوچی زبان میں رباعی کا تجربہ کیا گیا ہے۔ جدید بلوچی ادب میں اس صنف میں ابتدائی طور پر گل خان نصیر، عطا شاد، اکبر بارکزئی، مبارک قاضی وغیرہ کا نام آتا ہے، اس کے بعد زبیر مختار، کریم تحمل، جابر آسکانی، امجد زبیر، ملا کریم داد، فضل شیر بلوچ وغیرہ کا نام آتا ہے۔

بلوچی شاعری میں بھی کچھ شعرا کرام نے رباعی کا تجربہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ رباعیاں جو میری نظر سے گذری ہیں دیکھ کر نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ ٹیکنیکی لحاظ سے ٹھیک نہیں ہیں

۔ایسی غلط رباعیاں کہنے والوں میں ہمارے نامی شعرا بھی شامل ہیں۔ بات یہ ہے کہ یہ ایک نازک صنف ہے،ان کے مصرعے احتیاط طلب ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے شاعر کا مزاج رباعی سے رابطہ نہ رکھتا ہو تو کوشش کے باوجود کامیاب رباعی تخلیق نہیں کر سکتا۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ بلوچی شاعری میں رباعی کی روایت اتنی مضبوط دکھائی نہیں دیتی کہ اس کے مستقبل کے بارے میں کچھ کہہ سکیں(1)۔

بلوچی شاعری میں میر گل خان نصیر واحد شاعر ہیں جن کی رباعیات کو یوسف عزیز مگسی نے ترتیب دے کر کتابی شکل دی، جس کو "چار بندیاں" (رباعیات) کے نام سے بلوچستان اکیڈمی تربت سے شائع کیا۔

حوالہ جات:

1۔صبا دشتیاری۔ [illegible]۔2015۔سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی۔ ص۔131

2۔صبا دشتیاری۔2003۔ بلوچی زبان و لبزانک۔1۔سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

3۔صبا دشتیاری۔2007۔ بلوچی زبان و لبزانک۔2۔سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

4۔صبا دشتیاری۔2009۔ بلوچی زبان و لبزانک۔3۔سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

سانیٹ (Sonnet)

سانیٹ مغربی شاعری کی ایک قدیم صنف ہے۔ یہ چودہ مصرعوں کی ایک ایسی نظم ہوتی ہے جس میں ایک بنیادی جذبہ یا خیال کو دو بندوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ پہلے بند میں آٹھ اور دوسرے بند میں چھ مصرعے ہوتے ہیں۔ پہلے بند میں خیال کا پھیلاؤ ہوتا ہے اور دوسرے میں اس کی تکمیل کی جاتی ہے۔ کہیں کہیں پہلا بند بارہ مصرعوں پر اور دوسرا بند دو مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے مگر چودہ مصرعوں کی پابندی ضروری ہے۔ اس میں قافیوں کی ترتیب بدلتی رہتی ہے۔

سانیٹ (Sonnet) اطالوی لفظ سانیٹو (Sonnetto) سے مشتق ہے۔ جس کا مطلب مختصر آواز یا راگ کے ہیں۔۔۔ اس کے پہلے حصے کو Octave کہتے ہیں اور دوسرے حصے کو Sestet کہا جاتا ہے۔ یعنی پہلے حصے میں آٹھ مصرعے اور دوسرے حصے میں چھ مصرعے ہوتے ہیں۔ اس میں دو یا تین الگ قافیے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس کے حصے کی ترتیب قوافی شاعر کے صوابدید پر منحصر ہے۔

بلوچی کے جدید دور کے شاعروں نے بھرپور جدوجہد کی کہ بلوچی میں جدید شاعری کے مختلف متعارف کروائیں۔ سانیٹ میں میرے خیال کے مطابق پہلے شاعر عطا شاد ہیں۔ جنہوں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی۔۔۔۔۔ عطا شاد کے علاوہ جن شعرا شاعر کا سانیٹ ہمارے ہاتھ لگا وہ غنی پرواز اور اکبر بارکزئی ہیں۔ ان شعرا کرام کے سانیٹ میں ہمیں زبان کی شگفتگی، پختگی اور فکر و خیال کی گہرائی نظر آتی ہے۔ بلوچی شاعری میں سانیٹ کی مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں کیا جا سکتا اسی دوران بلوچی شعرا میں سے نوجوان شاعر فضل خالق کا ایک سانیٹ میرے نظروں سے گذرا۔ جس سے کہہ سکتے ہیں کہ امید کی کرن روشن ہے۔ ویسے یہاں ایک اور بات کا ذکر کروں کہ ہمارے موجودہ دور میں کچھ نوجوان اور نئے شاعر ہیں جن کا مستقبل روشن نظر آتا ہے۔ اگر وہ

راستے میں بے راہ رو ہو جائیں۔ قارئین میں معاف کریں تو میں بلا خوف و خطر چند نام لکھنے کے لیے
دل بیتاب ہوں۔ ان میں گل محمد وفا، منیر مومن، اسلم بزدار، کمدہ علی، زبیر مختیار، ممتاز یوسف
اور عید شاد شامل ہیں۔ سب شاعروں کو چاہیے کہ ان لعل و جواہر کو ضائع ہونے سے بچانے کے
لیے اپنا کردار ادا کریں (1)۔

حوالہ جات:

1۔ صبا دشتیاری۔ گلگدار ءِ چکار۔ 2015۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی۔
ص۔139

2۔ صبا دشتیاری۔ 2003۔ بلوچی زبان و لبزانک۔1۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

3۔ صبا دشتیاری۔ 2007۔ بلوچی زبان و لبزانک۔2۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

4۔ صبا دشتیاری۔ 2009۔ بلوچی زبان و لبزانک۔3۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

پیروڈی

پیروڈی لفظ پیروڈیا سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں جوابی نغمہ۔ یہ ایک ادبی طرز تخلیق ہے جس میں کسی نظم یا نثر کی نقل کر کے مزاح کا رنگ پیدا کیا جاتا ہے۔ بلوچی زبان میں پیروڈی کو "گیرگان" کہتے ہیں۔ پیروڈی یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں جوابی نغمہ۔

موجودہ دور میں تحریف نگاری کے میدان میں کوئی نامی شاعر نظر نہیں آتا۔ ہاں خدا سلامت رکھے اکرم صاحب خان کو جنہوں نے "ناکو تیاپ دپی" کے نام سے ہمارے ادب کے اس صنف کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر ہماری زبان کے منہ میں پانی کا قطرہ ڈالا۔ اب ہم فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری شاعری کا دامن ایسے اصناف سے خالی نہیں ہے(1)۔

اکرم صاحب خان کے ساتھ ہمیں صیاد شتیاری کا نام بھی ابتدائی تحریف نگاروں میں ملتا ہے۔ اکرم صاحب خان نے مراد ساحر، عطا شاد، سید ظہور شاہ ہاشمی، جی آر ملا اور انور صاحب خان کی غزلوں اور مبارک قاضی کی نظم کی نقل کی ہے، تو صیاد شتیاری نے اللہ بخش بزدار کی نظم کی نقل خوبصورت انداز میں کی ہے۔

حوالہ جات:

1۔ صیاد شتیاری۔ گلکار؛ چکچکار۔ 2015۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی۔

ص۔149

2۔ صیاد شتیاری۔ 2003۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 1۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

3۔ صیاد شتیاری۔ 2007۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 2۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

4۔ صیاد شتیاری۔ 2009۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 3۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

مزاحیہ شاعری

بلوچی زبان میں خوش طبعی یا مزاح کے عنصر سے بھرپور شاعری کو "وشکندی" یعنی خوش طبعی کہا جاتا ہے۔ اردو میں ہزل اس سے ملتا جلتا ہے۔ تاہم ہزل اس غیر سنجیدہ کلام کو کہا جاتا ہے۔ جس میں مزاح کے ذریعے تفریح پہنچانے کی کوشش کی گئی ہو لیکن مقصدیت زندگی سے عاری ہو۔ بلوچی زبان کے "وشکندی" میں ہزل کے عوامیت اور کہیں کہیں فحش عنصر کو ہلکے انداز میں چھونے کے ساتھ ساتھ مقصدیت بھی کوٹ کوٹ بھری ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ بلوچی زبان میں شاعری کی اس صنف کو صباد شتیاری نے "وشکندی" کا نام دیا ہے۔ وہ ہزل سے قربت ضروری رکھتی ہے۔ تاہم اسے ہزل کہہ نہیں سکتے بلکہ مزاحیہ شاعری یا خوش طبعی کی شاعری کہہ سکتے ہیں۔

بلوچی قدیم شاعری کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں ملا فاضل رند، ملا قاسم رند، نوراللہ خارانی اور جوانسال بگٹی کی شاعری میں بھی طنز و مزاح کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ اسی طرح کوہ سلیمان کے مری بگٹی و بزدار علاقوں میں بلوچوں کی مشہور و معروف شاعری جو "تزوسر" کی موسیقی کے ذریعے گائی جاتی ہے جس کو "دستانغ" (داستان) کہا جاتا ہے۔ اس میں بھی طنز و مزاح عنصر دکھائی دیتا ہے۔ واضح رہے کہ بلوچوں میں مقصد طنز و مزاح زخموں پر نمک پاشی نہیں بلکہ ناہمواری کی نشاندہی سے زخموں کا علاج نظر آتا ہے۔

مزاح کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک وہ جس میں ہلکا پن اور بازاری لہجے کا عنصر موجود ہو۔ تخلیق کاروں نے اس کام میں اپنا وقت برباد نہیں کیا ہے۔ دوسرا مزاح کے عنصر سے بھرپور تخلیق ہے۔ جس میں تخلیق کاروں نے انسان کے مزاح کی حس کو بڑھانے کی کوشش کی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس میں تربیت کے عنصر کے موجودگی کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی

باریکیوں کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے(1)۔

انسان کو بالعموم اور بلوچ کو بالخصوص مزاح اور مزاح نگاری کی اشد ضرورت رہی ہے۔اپنی پوری تاریخ میں یہ قوم جنگ وجدل، وبا، مرگ، بیچارگی، مفلسی میں مبتلا رہی ہے۔اس کے دل کی سختی، تنگی اور پریشانی کی شکنوں، جلاوطنی کے لیے اس کی سیاسی، معاشی زندگی کو بدل کر رکھنا ضروری ہے تو اسی طرح اس کی زندگی میں تفریح پیدا کرنا نہایت اہم ہے۔ادب اس سلسلے میں آکسیجن ہے مگر اس طرف بہت کم توجہ دی گئی(2)۔

میرے خیال میں اس وقت بلوچی کے بڑے محقق بھی نہیں جانتے کہ علی محمد سورتانی نے طنز ومزاح کے لئے گوہر قیمتی سے ہمیں نوازا ہے۔ان کی شاعری کا انداز قدیم شاعری کی طرح ہے۔لیکن شاعری میں مزاح ان کے بلند قامت شخصیت کو جاننے کے بعد ہی پہچانا جاسکتا ہے۔علی محمد سورتانی کے بعد ہمارے بزرگ شاعر میر احمد دہانی کے نام کو ہم بھول نہیں سکتے۔جس کی شاعری میں عوامی رنگ ہے۔انہوں نے طنز ومزاح میں وہ لعل وجواہر ہمارے ادب کو بخشے ہیں۔جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ان کا مجموعہ کلام "گاریں کاروان" (گمشدہ کاروان) کو جہاں سے بھی پڑھیں عوامی رنگ اور طنز ومزاح کی جھلک نظر آتی ہے۔لندن کی سیر ہو، یاد ہی کا ہوا، شیخ کا دھمال ہو یا لیاری کے پیر و نیتیوں کی صورت حال ہر بات میں خوش طبعی نظر آتی ہے ہمارے نوجوان شاعروں میں اکرم صاحب خان اس میدان میں گھوڑے دوڑاتے نظر آتے ہیں۔ناکو تیاب دپی کے قلمی نام سے بلوچی طنز مزاح پر مبنی شاعری کی کتاب "گواتی ہمات" اکرم صاحب خان کا تحفہ ہے۔میرے خیال میں یہ بلوچی شاعری میں خوبصورت اضافہ ہے۔اس کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اکرم صاحب خان کے مزاح میں پختگی موجود ہے اور یہ تخلیقی ضروریات پوری کرتی دکھائی دیتی ہے۔اس میدان میں بہت سے لوگوں نے طبع آزمائی کی ہے(3)۔

بلوچی میں طنز ومزاح کے کتابوں کی باقاعدہ اشاعت 1973 میں شروع ہوتی ہے۔اسی سال میر احمد دہانی کی کتاب "گاریں کاروان" 1973، اکرم صاحب خان کی کتاب "گواتی ہمات" اور اکرم صاحب خان کی کتاب "تل ءُ آزار" 1999 میں بلوچی دور ءُ ربید گی جت ءُ یونی انجمن، کراچی، عابد آسکانی کی کتاب "چو شمیں شوم ءُ شازدہ" 2000 میں، بہار گاہ چھاپ ہنگ، حب، عابد آسکانی کی کتاب "چو شمیں نیک و نیکیت" 2010 میں، بہار گاہ چھاپ ہنگ،

حب، عیسیٰ گل کی کتاب "پدرنگ"2010 میں آرچ کمیونیکیشن، پیشکان، اکرم صاحب خان
کی کتاب "پدگوانک"2012 میں زبان ببرین، ادبی حکیم کی کتاب "وشکند"2015 میں
رکیسی چھاپ و شنگ جاہ، کراچی، طارق پیشکانی کی کتاب "سنگ"2016 میں بلوچ سوشل میڈیا
گروپ، پایان عمر کی کتاب "رشتگ" 2016 میں آچار پبلی کیشنز، کراچی، طارق پیشکانی کی
کتاب "باوسر کاریت"2017 میں دیمروئی مجلس، یونس واہگ کی مرتب کردہ کتاب "تعلیں
جوز"2017 میں اسٹین شنگکار، کیچ، دلوش دانا کی کتاب "وروگ ءَ بنداں"2018 میں باچ،
ببرین، عیسیٰ گل کی کتاب "کلاگ ءَ زیراں" 2018 میں دیمروئی مجلس، عابد آسکانی کی
کتاب " 2018 میں بہارگاہ چھاپ و شنگ، حب، ناصر کوشلاقی کی کتاب "سنگ ءِ برشکندگ"
پاک نیوز ایجنسی، تربت کی جانب سے شائع ہوئی ہیں۔

حوالہ جات:

1۔ صبا دشتیاری۔2015۔ گلزار پنگاہ۔ سید ریفرنس لائبریری کراچی۔
ص۔171
2۔ شاہ محمد مری۔2012۔———————————۔ ص۔12
3۔ یونس واہگ۔2012۔ گچین تاک۔ تونیک۔ بلوچستان اکیڈمی، تربت۔
ص۔101-102
3۔ مجاہد بلوچ۔2021۔ کتاب گنج۔ شعبہ بلوچی، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ
4۔ عرفان جہلدیج۔2021۔ کتاب شون۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ
5۔ صبا دشتیاری۔2003۔ بلوچی زبان و لبزانک۔1۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی
6۔ صبا دشتیاری۔2007۔ بلوچی زبان و لبزانک۔2۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی
7۔ صبا دشتیاری۔2009۔ بلوچی زبان و لبزانک۔3۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

تضمین

تضمین کے لغوی معنی ہیں شامل کرنا، ملانا، جگہ دینا۔ اصطلاحِ شعر میں اس کا مطلب کسی مشہور مضمون یا شعر کو اپنے شعر میں داخل کرنا، چسپاں کرنا، شعر پر مصرع لگانا ہے۔ شاعر جب کسی دوسرے شاعر کے کلام، شعر یا کسی مصرعے سے متاثر ہوتا ہے تو اس میں کچھ اضافہ کرکے اپنالیتا ہے۔ شعری تخلیق کا یہ عمل تضمین کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ بلوچی زبان میں اس کو "امباز" کہا جاتا ہے۔

شاعری کی اصطلاح میں تخمیس کے معنی ہیں مخمس کی شکل میں کسی غزل یا غزل کے کسی شعر کی تضمین کرنا۔ قاعدہ اس کا یہ ہے کہ غزل کے ہر شعر سے پہلے مصرع اولیٰ کے قافیہ کی رعایت سے تین مصرعے اضافہ کردیتے جاتے ہیں۔ ایسے مخمس کے لئے بعض اوقات خمسہ کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ مرزا قلب حسین خان نادر نے مشہور شاعروں کی ایک ایک غزل لے کر اس کی تضمین کی ہے۔ عزیز بیگ مرزا نے غالب کی اردو غزلیات کی تخمیس کی ہے۔ اثر لکھنوی نے چکبست کی مشہور غزل کی تخمیس کی ہے جو ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے چھان بین میں خمسہ کے عنوان سے شامل ہے۔(1)۔

بلوچی ادب میں جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اب تک بہت ساری اصناف کا میدان خالی نظر آتا ہے۔ اس لئے تخمیس جیسی اصناف کے نقوش ڈھونڈنا مشکل کام ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ ایک دو نام بھی نہ مل سکیں۔۔۔۔۔۔ قدیم شاعری میں تخمیس نگاری کی شعوری مثال نظر نہیں آتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ جام درک کے بعد کے کسی شاعر نے تعریف کی خاطر جام کے ایک دو مصرعے کہہ کر اپنی بے بسی دکھائی ہے۔ البتہ جدید شاعری میں ہمیں مثال ملتی ہیں۔ جیسا کہ مولانا عبدالمنیب افشانی جو ایرانی بلوچستان میں بلوچی کے اچھے شاعر ہیں۔ وہ

فارسی کے چند مصرعوں کے تضمین لکھتے ہیں۔ میرے خیال کے مطابق یہ تضمین کے پہلے شاعر ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے انہوں نے زیادہ لکھے ہوں لیکن میرے نظروں سے ایک ہی گذرا ہے۔ لیکن اکبر بارکزئی کی تضمین میں نے دیکھے ہیں۔ انہوں نے بلوچی شاعری کو اچھے تضمین بخشے ہیں۔ اسی طرح ایک خاتون شاعرہ بانل دشتیاری نے بھی چند تضمین لکھے ہیں میں نے ان کے چند تضمین دیکھے۔ ان کو دیکھ کر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بلوچی زبان میں اتنی وسعت ہے وہ دیگر زبانوں کے ساتھ چل سکے۔(2)۔

اسی طرح ہمیں ضیب افشانی کی، "قدسی بوزیت" اور اکبر بارکزئی مرزا غالب اور حافظ شیرازی کے غزلوں اور بانل دشتیاری کی زیب النساء مخفی اور میر گل خان نصیر کے شاعری تضمین صباد شتیاری کی کتاب "گلکار ءِ چنکار" میں ملتے ہیں۔

حوالہ جات:

1۔ ابواعجاز حفیظ صدیقی۔ 2017۔ تاریخ اصناف۔ سنگت پبلی کیشنز۔ لاہور۔

ص۔ 211

2۔ صباد شتیاری۔ 2015۔ گلکار ءِ چنکار۔ سید ریفرنس لائبریری کراچی۔

ص۔ 159

3۔ صباد شتیاری۔ 2003۔ بلوچی زبان ءِ لبزانک۔ 1۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

4۔ صباد شتیاری۔ 2007۔ بلوچی زبان ءِ لبزانک۔ 2۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

5۔ صباد شتیاری۔ 2009۔ بلوچی زبان ءِ لبزانک۔ 3۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

قطعہ

قطعہ شاعری کی ایک صنف ہے۔ یہ چار مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ (قطعہ کے لیے اشعار کی تعداد کی قید نہیں ہے۔ قطعہ میں دو سے زیادہ اشعار بھی ہو سکتے ہیں۔) اس کے پہلے مصرع میں قافیہ یا ردیف کی کوئی قید نہیں ہے لیکن دوسرے مصرعے میں قافیہ لازمی موجود ہوتا ہے اس کے بعد اگر ردیف بھی لگا دیا جائے تو مصنف کی مرضی ہے، ورنہ ردیف کے بغیر بھی قطعہ کے اصول مکمل ہو جاتے ہیں لیکن قافیہ ضروری ہے پہلے دو مصرعوں کے بعد تیسرا مصرع آتا ہے۔ اس میں بھی قافیہ اور ردیف کی کوئی قید نہیں لیکن چوتھے اور آخری مصرعے میں دوسرے مصرعے کا ہم آواز قافیہ ضروری ہوتا ہے اور دوسرے مصرعے کے مطابق اگر قافیے کے ساتھ ردیف ہے تو وہی ردیف چوتھے مصرعے میں قافیے کے بعد اسی طرح لکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ قطعہ اس طرح بھی لکھا جاتا ہے کہ پہلے دونوں مصرعوں میں قافیہ یا قافیے کے ساتھ ردیف لگایا جائے مگر تیسرے مصرعے کو قافیہ اور ردیف سے آزاد رکھا جائے مگر آخری مصرعے میں یعنی چوتھے مصرع میں پہلے دو مصرعوں کا ہم آواز قافیہ اور وہی ردیف لگایا جاتا ہے۔ قطعہ نگاری کو بلوچی زبان میں "بتکر" کہتے ہیں۔

فارسی اور اُردو میں قطع کسی عنوان سے لکھا جاتا ہے۔ تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کے قطعے بھی شامل ہیں۔ جیسا کہ کسی شخص کی تاریخ ولادت کا حساب ایک قطع میں دیا گیا اگر کوئی الفاظ کے نمبر کے ذریعے تاریخ ولادت معلوم کرے تو واضح ہو جائے اسی طرح وفات کی تاریخ بھی۔ یہ روایت فارسی اور اُردو زبان میں اس وقت بھی برقرار ہے۔ بلوچی شاعری میں قطعہ بہت سے شعرا کرام کہتے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے ان شعرا نے قطعہ کی اہمیت کو سمجھے بغیر اسے رباعی جیسی شکل دی ہے۔ اس لئے ان کے معنی دیکھے جائیں تو یاد کے آتے ہیں۔ بلوچی شاعری میں ابھی تک بہت ساری اصناف نظر نہیں آتی اس لئے قطعہ نگاری کا مکمل طریقے سے نہ ہونا پریشانی کی بات نہیں ہے(1)۔

حوالہ جات:

1۔ صبا دشتیاری۔ 2015۔ گلکار ءُ نچکار۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی۔ ص۔ 33

2۔ صبا دشتیاری۔ 2003۔ بلوچی زبانءِ ابزارنک۔ 1۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

3۔ صبا دشتیاری۔ 2007۔ بلوچی زبانءِ ابزارنک۔ 2۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

4۔ صبا دشتیاری۔ 2009۔ بلوچی زبانءِ ابزارنک۔ 3۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

صوفی شاعری

صوفی شاعری بھی بلوچی ادب کا حصہ ہے۔ تصوف ایک باقاعدہ علم ہے، جس سے
تزکیہ نفس اور تعمیر باطن کا حصول ممکن ہے۔ اس لئے تصوف کا موضوع تزکیہ و تصفیہ اور تعمیر
باطن ہے اور اس میں وحدت الوجود کی معرفت ابدی سعادت کا حصول ہے۔ اس راہ کے راہی کو
صوفی کہا گیا ہے۔ ان کی زندگی کا مقصد خدا آگہی، خدایابی، حکمت و معرفت، ارتقائے خودی، روح
سازی، روحانیت، تکمیل شخصیت، سیرت، ذات فقیری و درویشی، قرب خداوندی، تقرب الٰہی
ہوتا ہے۔ تصوف لفظ صوف سے نکلا ہے۔ صوف موٹے اونی کپڑے کو کہتے ہیں۔ مسلمانوں سے
قبل بھی یہ روایت عیسائی راہبوں میں موجود رہی ہے کہ جب وہ ترک دنیا کرتے تو لذتوں،
آسائشوں اور آرام پسندی کو تج دیا جاتا۔ تاہم ہمارا موضوع بحث تصوف نہیں لہٰذا اس پر مختلف آراء،
خیالات و نظریات کے ذریعے حرف آخر تک پہنچنے یا کوئی رائے قائم کرنے سے بہتر ہے کہ ہم
اپنے اصل موضوع بلوچی صوفی شاعری کی جانب چلتے ہیں۔

بلوچی عارفانہ یا صوفی شاعری کا وجود ہمیں اٹھارہویں صدی میں ہی نظر آتا ہے کیونکہ
بلوچی شاعری کی طرح، صوفی شاعری میں بھی فلسفیانہ بھول بھلیوں سے ناآشنا حقائق پر مبنی نظر آتی
ہے۔ بلوچی کے نامور شعرا جام درک، ملا فاضل، ملا قاسم، مست توکلی، جوانسال بگٹی، پہلوان
فقیر، فیضل فقیر، وغیرہ کی شاعری میں ذات باری تعالیٰ، صفات الٰہی، واقع خروج، فکر و فنا،
صبر و رضا، جبر و اختیار اور وحدت الوجود وغیرہ ہی موضوع سخن نظر آتا ہے۔

مست توکلی بلوچی کلاسیکل شاعری کے افق کا چمکتا ستارہ ہیں۔ ان کی ولادت 1931ء
مری علاقے یعنی ضلع کوہلو کے "ماتڑک بند" میں ہوئی۔ سید حساس و حاتم کی نوجوان تھا۔ شکار کا
شوقین اور سیر و تفریح کا دلدادہ، سمی نامی خاتون پہلی بار اسے بارش سے بچا کر ساری زندگی ان پر

عشق کا ابر برساتی رہی۔ سمو کے ساتھ مست کا لقب بھی سمو سے ہی ہے ان کی والہانہ وابستگی اور سچی محبت کے باعث استعمال ہوا تھا۔ سمو کی محبت کے باعث مست توکلی بلوچی ہر رنگ میں ایک نامور رومانوی شاعر، ایک آزاد منش صوفی، ایک خدا رسیدہ بزرگ، ایک سچے عاشق اور ایک سچے انسان کے طور پر ہمیشہ امر رہیں گے۔

مست کی تمام تر شاعری اور ان کا فکر و فن ان کی والہانہ محبت کا ہی پرتو ہے جو ایک نقطے سے شروع ہو کر کائنات کی بیکراں وسعتوں میں پھیل جاتا ہے۔ گو کہ مست کی شاعری کا تانے بانے بظاہر سمو ہی کے گرد تا بنتے نظر آتا ہے لیکن اصل میں سمو وہ مرکزی نقطہ ہے جہاں مست پوری کائنات کو سمیٹے کبھی سندھ کے ریگستانوں اور کبھی کوہ سلیمان کی سنگلاخ چٹانوں اور ویرانوں میں سرگرداں نظر آتا ہے، اور سمو کی سرحدوں سے نکل آفاقیت کا روپ دھار لیتا ہے، اور امن پسندی اور انسان دوستی کا عالمگیر پیغام بن جاتا ہے۔

ـ ہمارے دل میں قرآن حکیم کے حروف فروزاں ہیں۔
میرے پاس صحف آسمانی کے اوراق کا ایک پرزہ ہے

ـ جنگ و جدل کی بے ہودہ باتیں اچھی نہیں
کون اپنے پیاروں کو دربدر رکھ سکتا ہے

ـ جس نے تجھے تاج جہاں بخشا
اس نے ہمیں پریشانیوں کے اسباب سے نوازا
جس کسی کو اس نے پر عیب پایا اسے تن کے لئے لبادہ دے دیا
اور جان بلب سمجھا اسے عریانی کا لباس دے دیا۔

جو انسال بگٹی 1885ء میں ڈیرہ بگٹی کے علاقے کھٹن میں پیدا ہوئے، ان کے والدین کم عمری میں وفات پا گئے۔ ان کی شیر زال دادی بی بی رضیہ نے ان کی پرورش کی، کہتے ہیں بی بی رضیہ خود ایک شاعرہ تھیں۔ ان کی پرورش کے باعث جو انسال نے شاعری کے میدان بڑا نام کمایا۔ یہ بھی کہتے ہیں ان کا ایک اور بھائی میر ولی محمد بشیر وانی (بجوانی) بھی شاعر تھے۔ ان کی شاعری کی کتاب بھی ہے۔ تاہم اس کا ثبوت اب تک محققین کے ہاتھ لگ نہ سکا۔ جو انسال اخلاقیات کے علم بردار شاعر تھے۔ وہ اپنے زمانے میں اخلاقی انحطاط پر بہت احتجاج

کرتے رہے۔ انہوں نے تسیا کو نوشی، جادو ٹوٹکوں، بے شرمی، بے حیائی کے خلاف شاعری کی،
وہ 1966ء میں وفات پا گئے۔

جوانسال ایک عوامی شاعر کی حیثیت سے اپنے علاقے کے عوام بلکہ تمام بلوچ قبائل کے حالات سے پوری طور پر واقفیت رکھتے تھے۔ وہ اپنے مقصدی نظریہ کے تحت جہاں تعمیری ادب کے ذریعے اپنے افکار و اذکار کو پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ وہاں ساتھ ہی فن کی باریکیوں کو بھی کام میں لاتے ہیں۔ جس سے انسانی جذبات، احساسات اور خیالات متاثر ہوتے ہیں۔ ان کے کلام کے چند نمونے پیش ہیں۔

ــ اے رب تعالیٰ! میں نے بے شمار دکھی انسان دیکھے ہیں
جیسے ریل کے ڈبے مسافروں سے بھرے ہوتے ہیں
وہ دکھی لوگ دکھ کی پروئی چھنکتی ہوئی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں
مصیبتوں کے جولانوں کی جھنکار بھی ساتھ ساتھ سنائی دیتی ہے
اے انسانو! یہ سب تمہارے کرتوتوں کا نتیجہ ہے
تمہاری بری عادتوں اور افعالِ بد کا ثمر ہے

....

ــ حیا اپنا رخت سفر باندھ کر چلی گئی ہے
اب صرف کپڑے ہی آدمیوں کے جسموں پر رہ گئے ہیں
حیا رات کی تاریکی میں اپنا رخت سفر سمیٹ کر پاپیدل روانہ ہوگئی
صبح ہوئی تو شرم اور شعور اس کا سراغ لے کر روانہ ہوئے
بالآخر انہوں نے اپنی ساتھی حیا کو پایا اور انہوں نے
کہا کہ اب ہم بھی نہیں جاتے، اس دور کو آگ لگے
لوگ حرام کھا کھا کر سانڈ کی طرح موٹے ہوگئے ہیں۔

....

ــ اے رب ہماری آنکھوں نے تیری قدرت کے بہت سے رنگ دیکھے ہیں
کبھی امن وامان ہے تو کبھی لڑائی ہے برپا

کبھی تو انسان اپنی اشکار سے پہاڑوں کے دل ہلا دیتا ہے
کبھی جان جسم سے نکلنے کو بے قرار ہے اور دم گلے میں اٹکا

صوفی پہلوان فقیر 1292 ہجری میں اپنے آبائی گاؤں رند واہی، جاگیر ضلع جیکب آباد میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام بڈھو فقیر تھا۔ وہ فتح پور ضلع کند اوہ میں حضرت صوفی رکھیل شاہ کے ہاتھ بیعت ہوئے۔ انہوں نے شاعری ابتدائی عمر سے شروع کی۔ ان کی شاعری میں سر مستی، عاجزی، وانکساری کے ساتھ ساتھ حمد، ثنا، مدح، نعت، منقبت اور ہمہ اوست کی صفات شامل ہیں۔ انہوں نے بلوچی میں کئی خوبصورت کافیاں دوہے اور سے حرفیاں کہی ہیں۔ وہ ہفت زبان شاعر تھے۔ انہوں نے سندھی، سرائیکی، فارسی اور اردو وغیرہ میں شاعری کی۔ ان کے کثیر اللسانی کلام کا دیوان "دعوت العشق" کے نام سے پہلی بار 1952ء میں، دوسری بار 1984 میں اور تیسری مرتبہ 2011 میں شائع ہوا ہے۔ 6 جمادالثانی 1358 ہجری میں انہوں نے جہان فانی کو چھوڑ کر دارالبقا کی جانب راہی ہوئے۔ وہ ڈوکی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔

صوفی پہلوان فقیر کی شاعری نہایت آسان اور سادہ اطوار پر مشتمل ہے جس میں سندھ کے دیگر اعلیٰ پایے کے صوفی شعراء کے کلام کی طرح تصوف کی چاشنی بھرپور انداز میں پائی جاتی ہے۔ ان کے بلوچی اشعار کے تراجم پیش ہیں۔

؎ محبوب تجھے مولا لائے
اپنے دلدار کی زیارت کروں
خدا جانتا ہے کہ دن و رات
تیرے لئے ہے محبت کا جذبہ
تیری جانب ہمہ تن گوش ہوں
میرا دل تیرا ہی طلب گار ہے

پہلوان فقیر کے ہم عصر بلوچی کے نامور صوفی شاعر گزرے ہیں جن کا نام صوفی فیض محمد فیضل ہیں۔ جو فیضل فقیر کے نام سے مشہور و معروف ہیں۔ ان کے والد کا نام خان محمد تھا۔ وہ گاجان موجودہ ضلع جھل مگسی کے رہائشی تھے اور بلوچ قوم کے لاشاری حسن کے منگلانی پھلی سے تعلق رکھتے تھے۔ 3 ربیع الثانی 1301 ہجری میں پیدا ہوئے۔ شاعری میں تصوف ان کا پسندیدہ

موضوع تھا۔ انہوں نے بلوچی زبان کے علاوہ سندھی، سرائیکی، اردو، فارسی اور براہوی میں بھی شاعری کی ہے۔ انہوں نے کم عمری میں شب بیداری، نفس کی پاکی، دل کی روشنی اور روحانی میدان میں قدم رکھا جس کی بدولت وہ روحانیت کے میدان میں عشق حقیقی کی منزل کو چھوتے رہے۔ وہ صوفی فیضل فقیر کے نام سے مشہور ہیں۔

میں تجھے کہاں ڈھونڈوں تیری جگہ تو یہیں ہے

خود ہی بتا کہ راز پوشیدہ کہ لامکاں ہے تو

فیضل کچھ لمحے خاموش رہ خود نمائی نہ کر

کہ محبوب خود اپنا پردہ آپ ہی ہے

بلوچی عارفانہ شاعری کے مزید نام بھی ہیں۔ ان میں فیضل فقیر اور پہلوان فقیر کے مرشد صوفی رکھیل شاہ نے بھی سندھی، سرائیکی، فارسی کے ساتھ ساتھ بلوچی میں اشعار کہے ہیں۔ صوفی چیزل شاہ کے بارے میں کہتے ہیں انہوں نے مختلف زبانوں میں عارفانہ شاعری کی لیکن دونوں درویشوں کی بلوچی شاعری ان کے فقیروں یا وارثوں کے ہاتھوں ضائع ہو گئی ہیں یا الماریوں کی زینت ہے۔ اسی طرح جلال فقیر، دا جل، مولوی محمد حسن و دیگر نام بھی قابل ذکر ہیں۔

ہائیکو

ہائیکو جاپانی صنف شاعری ہے۔ وہاں ابتدائی دور ہی سے مختصر نظمیں قبول عام رہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے برصغیر میں دوہے، ٹپے، ماہیے اور بلوچی زبان میں ڈیہی، لیکو، لیلی مور اور لیلاڑی شامل ہیں۔ ہائیکو میں جاپانی تہذیب، ثقافت اور روایت پوشیدہ ہیں۔ صرف تین مصرعوں میں سب کچھ کہہ دینے کے جذبے نے "ہائی کائی" یا "ہائیکو" کو جنم دیا۔ جس میں صرف سترہ صوتی اجزا 5،7،5 کے تناسب سے استعمال ہوتے تھے۔ مشہور جاپانی شاعر باشو نے اس صنف کو اپنی شاعری میں پہلی مرتبہ اختیار کیا اور یوں "ہائی کو" وجود میں آئے۔ "ہائیکو" اصل میں "ہوکو" کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ جس کا مطلب جاپانی نظم کا ابتدائی حصہ ہے۔ دریا کو کوزے میں بند کرنے کا فن جس طرح غزل کے دو مصرعوں میں شاعر تخیل کی ایک کائنات سمو دیتا ہے۔ اسی طرح ہائیکو میں بھی سترہ صوتی اجزا پر مشتمل تین مصرعوں میں سب کچھ کہہ دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بلوچی زبان کے نامور محقق اکبر فشاد ہائیکو اور اس خطے میں موجود دیگر زبانوں کی مختلف لوک شاعری کے اصناف میں مماثلت کا اظہار کرتے ہیں۔

"ابتدائی طور پر ہائیکو اگرچہ جاپانی نظم کی شکل ہے لیکن ہمارے خطے میں بہت سی زبانوں کی لوک شاعری میں اس کے نمونے نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ اردو میں ثلاثی، ثلاثات سے حرفی، مثلث، پنجابی میں ماہیا، سندھی میں ہیڑو، بلوچی میں ڈیہی اور پشتو میں ٹپہ اس کے نمونے کہلاتے ہیں (1)۔

ہائیکو جاپانی سے انگریزی پھر اردو زبان میں سفر کرتا ہوا خطے کی دیگر زبانوں کی طرح بلوچی زبان کے جدید ادب کا حصہ بن چکا ہے۔ تاہم ڈیہی، لیلی مور، لیکو جیسے دلکش اصناف کی موجودگی میں اس کو پھلنے اور پھولنے کا میدان نہیں مل سکا۔ تاہم صبا دشتیاری ایک شعر میں ہائیکو

کو موضوعِ سخن یوں بناتا ہے۔

ے زندانت ہائیکو
پمن شعرانی تجا
رہندانت ہائیکو

یعنی زندگی ہے ہائیکو
میرے شاعروں کا صرف
کلام ہے ہائیکو

اور مزید یوں سخن آرا ہوتے ہیں۔

ے زانت ہوز بہری تنی
رنگراہاں وز موش کنان ے
زانان گھری تنی

یعنی

جانتا ہوں تیری محرومی کو
راستوں کو بھول جاتے ہو
تیری گمشدگی کو جانتا ہوں

ے روزن ہ کور مکن
زندہ نو کاپ ہ شہر چو
جام ہ سور مکن

یعنی

روشنی کو مدھم نہ کر
زندگی کے سنے پن کے
ذائقے کو کھارا نہ کر!

- چو ہمیں طوفانان انت
نو کمیں روژن ولے عہد ءَ ہم
انسان حیوان انت

یعنی

کیسا طوفان ہے
نئی روشنی اس دور میں بھی
انسان حیوان ہے

نوشت بہار بلوچی ادب میں نمایاں نام ہے۔ دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہائیکو میں بھی طبع آزمائی کی ہے جیسا کہ

- خبر کئی انت؟
من ءَ چہ خبر ہست گلامے آں
خبر تئی انت۔

یعنی

بات کس کی؟
مجھے کیا پتہ ہے غلام ہوں
بات تو تیرا ہے۔

حوالہ جات:

1۔ اکبر نشاد۔2017۔ بلوچی نوکیں نظم۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ ص۔69

افسانہ نگاری

افسانہ کو بلوچی میں "آزمانک" کہتے ہیں اور افسانہ نگار کو "آزمانکاریا آزمانک نویس" کہتے ہیں۔ افسانہ ہمیں بلوچی ادب کی قدیم عوامی داستانوں اور کہانیوں میں واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ تاہم تکنیکی طور پر افسانہ نگاری کا آغاز بیسوی صدی کی پچھلی دہائی میں ہوتا ہے۔ بلوچی زبان میں افسانہ نگاری کا آغاز 1951 میں بلوچی رسالے "اومان" کے اشاعت سے شروع ہوتا ہے۔ پھر 1956 میں ماہنامے "بلوچی" کے آغاز سے مزید تقویت ملی۔ یوں بلوچی افسانے نے ترقی کا آغاز کیا۔ اس سے قبل ہو سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کی گئی ہو جو اشاعت کے مراحل طے کر کے قارئین تک نہ پہنچ سکی ہو۔ اس لئے کہا جاتا ہے بلوچی میں افسانہ بیسویں صدی کی پچھلی دہائی کے پہلے سال میں سامنے آیا۔

بلوچی ادب میں افسانہ نگاری کا آغاز 1951 میں اس وقت ہوا جب مولوی خیر محمد ندوی نے کراچی سے "اومان" کے نام سے ایک بلوچی ماہنامے کا اجرا کیا جو بلوچی ادب میں نئے رجحانات کا نقیب ثابت ہوا۔ بلوچی کا پہلا افسانہ "بےوفا" جسے محمد حسن کاکولی نے تحریر کیا۔ مئی 1951 میں اسی رسالے میں شائع ہوا۔ تاہم تیکنیکی اعتبار سے ناقدین کو اسے افسانہ تسلیم کرنے میں تامل رہا ہے۔ بلوچی کا دوسرا افسانہ عبدالغفور بلوچ کا افسانہ "شرپلی" ہے، جو اگست 1951 میں ماہنامہ اومان میں شائع ہوا۔ جبکہ انور شاہ قیصرانی کے افسانے "افسانہ" کو بلوچی کا تیسرا افسانہ تصور کیا جاتا ہے۔ یہ افسانہ ماہنامہ اومان کے نومبر او سمبر کے شمارے میں شائع ہوا۔ شیر محمد مری وہ پہلا شخص ہے جس نے تیکنیکی اعتبار سے معیاری افسانے لکھے۔ ان کے افسانے "گنوک" (پاگل) اور "جاڑو" (معذور) نہ صرف ابتدائی دور کے بلکہ آج بھی بلوچی کے نمائندہ افسانوں میں شمار ہوتے ہیں (1)۔

اصغر محرم لکھتے ہیں کہ میری تحقیق کے مطابق بلوچی کا پہلا افسانہ محترم محمد حسن کلا کوئی کا ہے کہ "بے وفا" کے نام سے بلوچی زبان کے ماہنامے "اومان" کے مئی 1951 کے شمارے میں شائع ہوا۔ جبکہ دوسرا افسانہ عبدالغفور بلوچ کا ہے جو "شرابی" کے نام سے "اومان" کے اگست کے شمارے میں شائع ہوا اور تیسرا افسانہ محترم انور شاہ قطبانی کا ہے جو "افسانہ" کے نام سے "اومان" کے نومبر اور دسمبر 1951 میں شائع ہوا(2)۔ جبکہ معیاری افسانوں کی بات آتی ہے تو اس کے بارے میں عبداللہ جان جمالدینی لکھتے ہیں "پہلا اچھا افسانہ شیر محمد مری کا "گنوک" ہے جو جرگہ کے ظلم و خرابیوں کو بیان کرتا ہے اور بلوچ معاشرے میں عورت کی سماجی حیثیت کو اجاگر کرتا ہے(3)۔ یہ افسانہ پہلی مرتبہ بلوچی ماہنامے "اومان" کے نومبر 1952 کے شمارے میں شائع ہوا۔

افسانہ نگاری کے میدان میں پہلے افسانہ نویسوں میں ماسٹر حسن تاج، میر شیر محمد مری، صورت خان مری، سید ظہور شاہ ہاشمی، انور شاہ قطبانی، مراد ساحر، نسیم دشتی، آسکو جمالدینی، عبدالرحمن غور، عبداللہ جان جمالدینی، آزاد جمالدینی (ملاروی)، قرت العین حیدر، عنایت اللہ قومی، مراد آوارانی وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے موضوع قومی مسائل، طبقاتی بالادستی، مالی و اقتصادی عدم مساوات، خواتین کے استحصال، غربت، قحط سالی، بے روزگاری، عوامی مسائل اور علاقائی مسائل پر مبنی ہیں(4)۔ اسی دہائی کے دوسرے قابل ذکر افسانہ نگاروں میں طاہر محمد خان، محمد بیگ بیوچ، عصمت اللہ جمالدینی، عبدالقادر نوری، فقیر محمد عنبر، گلزار خان مری، کریم دشتی، عبدالغفار ندیم، برکت علی اور بعض دیگر شامل ہیں۔ یہ افسانے زیادہ تر پسماندہ دیہی معاشرے کے پس منظر میں محبت اور دوستی، غربت، طبقاتی عدم مساوات، ظلم و زیادتی، فرسودہ رسم و رواج اور اسی نوعیت کے دوسرے موضوعات پر ہیں۔ یہ سماجی حقیقت پسند اور رومانی حقیقت پسند تکنیکوں میں لکھے گئے ہیں۔

ساتویں دہائی میں ماہتاک اولس کوئٹہ اور پندرہ روزہ زمانہ کراچی جیسے رسائل شائع ہونے لگے تو لکھاریوں کے لئے سازگار ماحول پیدا ہوا۔ یوں ان رسالوں کی اشاعت کے اثرات اور معاونت سے بعض نئے افسانہ نگار نمودار ہوئے اور بعض پہلے سے موجود افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں فنی نکھار پیدا ہوا۔ جس کی بدولت نعمت اللہ گچکی، صورت خان مری اور نسیم دشتی جیسے لکھاری اچھے افسانہ نگاروں کے طور پر ابھر کر سامنے آئے۔ جن کے سب سے خوبصورت افسانوں میں

نعمت گچکی کے افسانے "اشتے بست" (ایک ستارہ ٹوٹا) "اے زندے" (یہ زندگی ہے) اور "زند پہ ہزار جنجال" (زندگی ہزار مصیبتوں کے ساتھ) اور صورت خان مری کے افسانے "بندی خانہ ءِ ہاہوٹ" (قید خانے کا پناہ گزین)" کپہنل" (ادھا پھول) اور پروش ءِ سوب (شکست کی فتح)۔ اور نسیم دشتی کے "ناکو" (چچا) اور "سور" (شادی) بھی شامل ہیں۔ جو بلوچستان کے پسماندہ استحصال زدہ معاشرے کے پس منظر میں سماجی، رومانی، جنسی، سیاسی اور انقلابی موضوعات پر بیانیہ، سماجی میں حقیقت پسند تکنیکوں میں لکھے گئے۔ اسی دوران مغربی اور مشرقی ذہنوں کے لکھاریوں کے بلوچی میں ترجمے شائع ہونے لگے۔ جن میں چیخوف، گورکی، موپساں، سمرسٹ ماہم، ہمنگوے، ولیم سرائن، ای لوکس، یوسف سباعی، اشرف محی الدین، قاضی نذر الاسلام، کرشن چندر اور دیگر نامور افسانہ نگار شامل تھے۔ جس سے افسانے کے فن ہیئت اور تکنیک کے اعتبار سے بلوچی زبان کے افسانہ نگاروں کے علم اور شعور میں اضافہ ہوا اور بلوچی افسانے کی ترویج میں مزید وسعت آئی۔
اس دہائی میں بلوچی افسانوں کی سید ظہور شاہ ہاشمی کی پہلی باقاعدہ کتاب 1969 میں "میر گند" کے نام سے سید ہاشمی اکیڈمی، گوادر کی جانب سے شائع ہوئی اور حکیم بلوچ کی ترتیب شدہ کتاب 1970 میں "چمین آزمانک" کے نام سے بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے شائع ہوئی۔

بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں بلوچی میں افسانہ لکھنے کی رفتار میں نسبتاً تیزی آجاتی ہے اور متعدد نئے رسالے شائع ہونے لگے۔ جو بلوچی افسانے کی ترویج و ترقی میں اپنا بھرپور کردار کرتے ہیں اور نئے افسانہ نگار میدان میں اترتے ہیں۔ جن میں غوث بخش صابر، سلطان نعیم قیصرانی، حکیم بلوچ، عبدالمالک بلوچ، عزیز محمد بگٹی، عبدالقیوم سربازی، عبدالقادر مظاہر، عباس علی زیگی، تاج محمد طائر، منیر احمد بادینی، منیر عیسٰی، علی ریئسی، بشیر بلوچ، غنی طارق، الفت نسیم، غوث بہار، فضل خالق، مبارک علی بلوچ، غلام فاروق، بابل ءِ شتیادی، گوہر ملک، فاطمہ مینگل دراشدہ بلوچ، غنی پرواز اور بعض دیگر شامل ہیں۔ اس دہائی کے افسانوں میں موضوعات اور تکنیکوں کے لحاظ سے مقداری اور صنفی طور پر ہر قسم کی ترقی ہوئی۔ چھٹی اور ساتویں دہائیوں کے موضوعات اور تکنیکوں کے ساتھ کچھ نئے موضوعات اور تکنیکیں بھی نظر آتی ہیں۔ جن میں نفسیاتی موضوعات اور نفسیاتی حقیقت پسند تکنیک اور علامتی تکنیکیں شامل تھیں۔ خاص طور پر مبارک علی بلوچ نے سماجی، جنسی اور جنسی نفسیات پر لکھا۔ سماجی جنسی اور نفسیاتی حقیقت پسند

تیکنیک کا افسانہ "مہات گنجے کہ دل بدر بجے" (ایسے خزانے پر لعنت ہو جو دل دکھائے) مجموعی طور پر ایک نئی چیز تھی۔ جبکہ غوث بخش صابر کا سیاسی موضوع پر لکھا گیا علامتی افسانہ "دوروگ و درمان" (درد مند کی دوا) اس سے بھی زیادہ دلکش تحریر تھی۔ یہ دونوں افسانے بلوچی افسانے کے نئے امکانات کے پیش خیمے نظر آتے ہیں۔ اسی دہائی میں مولا بخش مشتاق کی کتاب 1973 میں "ساہو گی سیرا" چھاپ وشنگ کراچی کی جانب شائع ہوتا ہے۔

نویں دہائی میں بلوچی افسانے کو نئی جہت ملتی ہے جو بلوچی افسانے کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی دہائی ہے جس میں بلوچی افسانہ شعور کی گہرائیوں کو چھونے لگتا ہے اور خارجی دنیا کے ساتھ ساتھ نت نئی جہتوں سے زیادہ سے زیادہ زور آزمائی ہونے لگی اور سیاسی، نفسیاتی، جنسی موضوعات اور علامتی کرداروں کے استعمال سے جدید جہت سے روشناس ہوا۔ بہت سے نئے افسانہ نگاروں نے جنم لیا۔ جس میں صیاد شتیاری، رزاق نادر، حفیظ حسن آبادی، ڈاکٹر علی دوست بلوچ، لطیف عادل، اسحاق محمود، عزیز پیکانی، غنی گل، زینت ثنا، فریدہ انجم، مبارک قاضی، عبداللطیف عادل، ممتاز یوسف، ناگمان ہمدم، سعید احمد کاشانی، یاسین مجروح، بہرام بلوچ، ستار میاوہ، راشدہ بلوچ، بشریٰ ملک، منصور بلوچ، اے آر داد، طارق غنی، اصغر علی آزگ، یار محمد یار، تاج محمد طاہر، زرین آسکانی، محمد کریم آزاد، رحیم بخش آزاد، باقر علی شاکر، شبیر ابرابی اور دیگر کئی شامل تھے۔ ان نئے افسانہ نگاروں نے اس کاروان میں پرانے افسانہ نگاروں کا ساتھ دینے کے علاوہ بلوچی افسانے کو نئے اسلوب کے سنوارنے اور اس معیار کو بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ادبی رسالوں و جرائد اور ادبی تنظیموں نے لکھاریوں کو ساز گار ماحول فراہم کیا۔ جن ادبی اداروں نے اشاعتی پروگراموں کے ذریعے لکھاریوں کو متحد کر کے زیادہ اور معیاری ادب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، سید ہاشمی اکیڈمی کراچی، سید لبزانکی مجلس عرب امارات، عزت اکیڈمی پنجگور، لبزانکی کاروان تربت، لبزانکی سرچمگ۔ تربت، ملا فاضل اکیڈمی تربت و دیگر شامل ہیں۔ اس دہائی میں پرانے اور نئے افسانہ نگار لکھنے میں مصروف عمل دکھائی دیتے ہیں۔ اس تنظیم کی وجہ سے معیار پر بہت اثر پڑا۔ اس دہائی میں غوث بہار اور عباس علی زیمی نمایاں نظر آتے ہیں۔ غوث بہار نے بلوچ قوم کی قومی نفسیات کو موضوع سخن بنایا اور اپنے علامتی افسانے "محشر" (قیامت) کے ساتھ اس میدان میں اترے کیونکہ یہ افسانہ بلوچی افسانے

کی دنیا میں بچ بچ ایک محشر سے کم نہ تھا۔ جس کے اب تک برصغیر کی ڈیڑھ درجن کے لگ بھگ زبانوں میں تراجم بھی ہو چکے ہیں۔ اسی طرح عباس زیبی نے انسانی نفسیات کو موضوع بنایا۔ وہ جدید افسانے "ہر جاہ من زبرے بر" (جہاں چاہو مجھے لے جاؤ) کے ساتھ اس میدان میں حاوی نظر آئے۔ اس طرح کے موضوعات بلوچی افسانے کے صنف میں نئے تجربے تھے۔ نئے رجحانات نے نہ صرف افسانہ نگاری کو نئی جہت دی بلکہ نئے لکھاریوں کے لئے نئی راہیں متعین کیں۔ اس سفر کے آغاز نے بلوچی افسانہ نگاری کو جلا بخشی جس کا سہرا اس دہائی کے نئے اور پرانے اہل قلم کو جاتا ہے۔ جنہوں نے شب و روز کی محنت، لگن، جرات کے ساتھ خیالات، نظریات، حالات، واقعات اور علامتی تکنیکوں کی آمیزش سے نئے ادبی ماحول کو جنم دیا۔

یہ دہائی اپنی اہمیت کے سبب سیاسی، سماجی، اقتصادی اور معاشرتی ترقی کی سطح پر بین الاقوامی تبدیلیوں کا پیش خیمہ بنی۔ بائیں بازو کے نظریات کے حامل افراد نہایت ہی اثر انداز ہوئے جبکہ امریکہ واحد عالمی طاقت کے طور پر دنیا کے افق پر نظر آتا ہے۔ وہ اپنے نیو ورلڈ آرڈر اور گلوبلائزیشن (عالمگیریت) کے نظریات کے ساتھ پوری دنیا پر اپنی بالادستی کے ذریعے ان کے وسائل کو اپنی دسترس میں رکھنے کی جدوجہد میں مصروف عمل ہو جاتا ہے۔ یہ نئی صورت حال بلوچی ادب پر اثر انداز ہوتی ہے، جس سے بلوچی افسانے کو نئے موضوعات مل جاتے ہیں اور بعض پرانے موضوعات کو نئے رجحانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جن میں نئے معاشی، معاشرتی مذہبی، سیاسی، نفسیاتی، صنعتی، تعلیمی اور بین الاقوامی موضوعات شامل ہو جاتے ہیں۔ ان حالات نے نئے افسانہ نگاروں کو بھی جنم دیا۔ جن میں اللہ بخش کرد، عطاءاللہ قطانی، عبدالصبور بلوچ، باقر علی شاکر، اے آر داد، اصغر علی آزگ، اکبر علی، سید محمد عید، بیزن صبا (ڈاکٹر بیزن بلوچ)، یٰسین مجروح، رفیق زاہد، ناگمان ہمدم (ڈاکٹر ناگمان)، یونس حسین، حنیف شریف، غلام نگوری، مقبول انور، غنی پہلوان، محسن بالاچ، نذیر ناصر، اقبال بالی، واحد بزدار، ساجد بزدار، قمرالنساء نذیر ناصر، عبدالصمد امیری، چراغ لاشاری، منظور بسمل، آمنہ، گوہر حسن آبادی، طاہر حکیم، ستار سی، پیرل شے نگری، ولید گریوئی، منیر مجید، سید میار نوری، عابد بلوچ، عبدالخالق خالد، حمید شاد، اور واحد قیصرانی، اکبر قشاد و دیگر لاتعداد افسانہ نگار شامل ہیں۔

اس دہائی میں 1981 میں عزیز بگٹی کی کتاب "تو ءِ ور کام" اور 1983 میں الفت نسیم کی کتاب "آجوئی ءِ گرشن" قلات پبلی کیشنز کوئٹہ کی جانب سے شائع ہوئی۔ 1983 میں غنی طارق

کی کتاب "جالار" رخشان نیوز ایجنسی، پنجگور کی جانب سے، 1987 میں واحد دہانی کی کتاب "دہانی، ڈنمارک، 1988 میں غوث بہار کی کتاب "زر گوات"، 1990,1989 میں منیر بینے کی کتابیں "تودی شُنز" اور "کپند" تواے وطن پبلی کیشنز، کوئٹہ کی جانب سے شائع ہوئیں۔

بیسویں صدی کی آخری دہائی میں بعض لکھاریوں نے نئے موضوعات اور رجحانات سے فائدہ اٹھایا اور اس میدان میں اپنے زورِ قلم سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ جن میں ڈاکٹر ناگمان، اللہ بخش کرار، یونس حسین والے آوردار اور حنیف شریف زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ جن میں ناگمان کا علامتی افسانہ "دار واسپ" (لکڑی کا گھوڑا) اس دہائی کے اچھے افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔ جس کا مرکزی خیال گزشتہ صدیوں کے ایک خوش آمدہ خواب پر مبنی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی کے مغرب کے خاندانی نظام کے موضوع پر تیز شہری اور سماجی حقیقت پسند تکنیکوں کا افسانہ "کورو تیار" (دریائی گند) اس دہائی کا بہترین افسانہ نظر آتا ہے، جس کے ذریعے مدبر افسانہ نگار نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ مغربی ممالک کی نام نہاد ترقی کے منفی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ جہاں ترقی کے اثرات سے خاندانی نظام کا ڈھانچہ منتشر نظر آتا ہے اور والدین اور بچے ایک دوسرے سے لاتعلق نظر آتے ہیں۔ جس کے باعث تنہائی کا عفریت نوعِ انسانی کو ہڑپ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اسی طرح جاپانی کے ایٹمی دھماکوں کے بعد تباہکاری کی تباہ کاریوں کے پس منظر میں غریب دیہی اور مفلوک الحال بلوچوں کی تباہ حالی پر بانک گوہر ملک کا افسانہ "بلوچ ءَ منی ءَ دھکاوات" (بلوچ نے مجھے دھکا دیا) بھی اپنی مثال آپ ہے۔ جس میں غربت، بھوک، افلاس زدہ زندگی کی عکسیاں دکھائی دیتی ہیں۔ محمد بیگ بیگل بلوچ کا طنزیہ افسانہ "انعام" بھی ایک قابلِ ذکر اضافہ نظر آتا ہے ۔ جس میں انعام کے خواہش مند ایک شخص کو اپنی بساط کے برخلاف انعام ملتا ہے۔ جس کے باعث وہ خوش ہونے کے بجائے پریشان ہوتا ہے۔

1991 میں عباس علی زیمی کی کتاب "توہل" عباس زیمی اکیڈمی لیاری کراچی کی جانب سے، 1992 میں غنی پرواز کی کتاب "سانگل" بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے، 1994 میں منیر بینے کی کتاب "گرکی گل" تواے وطن پبلی کیشنز کوئٹہ کی جانب سے، 1994 میں صبا دشتیاری کی کتاب "بون ءُ بوشام" عزت اکیڈمی پنجگور کی جانب سے، 1995 میں غنی پرواز کی کتاب "بے منزلیں مسافر" بلوچستان اکیڈمی تربت کی جانب سے، 1997 میں غنی پرواز کی کتاب "مہرءِ بہا گپت"

نہ بیت "بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے، 1997 میں غنی طارق کی کتاب "گزان ء کاروان"، 2000 میں تاج محمد طاہر کی کتاب "سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ کراچی اور حکیم بلوچ کی کتاب "واتگ ء مرگ" بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے شائع ہوئیں۔

اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں نئے عالمی اور ملکی حالات کا جنم ہوتا ہے۔ امریکہ دنیا کے واحد سپر پاور کی حیثیت سے پوری دنیا پر تسلط جمانے لگتا ہے۔ افغانستان اور عراق میں جنگیں رونما ہوتی ہیں۔ کئی دیگر ممالک ان خطرات کے پیش نظر ہیں۔ اس صورت حال میں دنیا بھر میں معاشی ،معاشرتی ،سیاسی، ثقافتی ،مذہبی، فکری ،نفسیاتی اور ادبی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان حالات کے نتیجے میں موضوعات کا نیا سلسلہ شروع ہوا کیونکہ ملک میں بھی دہشت گردی، خانہ جنگی، فوجی آپریشن ،ماورائے آئین و عدالت اغوا، گمشدگیاں اور ہلاکتوں کے سلسلوں کا آغاز ہوتا ہے۔ جس سے قوم دوستی، وطن دوستی، سامراج دشمنی آزادپسندی، خواتین کے حقوق، بچوں کے حقوق، اغوا ،گمشدگیاں، ہلاکتیں، تنہائی، خوف، عدم تحفظ، دکھ درد اور ذہنی، فکری اور شعوری کرب سمیت بہت سی چیزیں شامل ہوئیں۔ جس سے نئے رجحانات کا جنم ہوا اور سابقہ جہتوں میں تبدیلیاں اور بہتری پیدا ہوئی۔ ان حالات سے اہل قلم کو جدید راہیں متعین کرنے پر مجبور کیا۔ نئی تحریک کے اثر میں بلوچی افسانہ نگاروں میں حکیم بلوچ، غنی پہوال، منیر مومن، صبیحہ کریم، آصف شفیق، گلاب غالب، اشرف شاد، غنی شریف، ساجد حسین، مقبول ناصر، قیوم فنکار، خشندہ تاج، کی پرواز، کریمہ محراب، مطلب بلوچ، عندلیب گچکی، زاہدہ رئیسی، راشدہ بلوچ، عمرانہ رشید و دیگر شامل ہیں۔

مذکورہ بالا تخلیق کاروں نے معیاری اور تجرباتی افسانے تخلیق کر کے بلوچی ادب کی ترقی میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ ان میں غنی پہوال کے ثقافتی موضوع اور ثقافتی حقیقت پسندی پر مبنی افسانہ "دہیگ" کو کافی پذیرائی ملی۔ جس میں بلوچی ثقافت کے احیا پر زور دینے کے ساتھ ساتھ خالصتاً بلوچی زبان کا استعمال بھی نظر آتا ہے۔ منیر احمد بادینی کا افسانہ "ہزار ئیں پاسانی شپ" (ہزار ہا پہروں والی رات) اور ڈاکٹر علی دوست بلوچ کا افسانہ "تاپ" (چھاپہ) اس دہائی کے بہترین افسانے شمار کیے جاتے ہیں جن میں اول الذکر تنہائی، خوف اور عدم تحفظ کے موضوع پر وجودی تکنیک میں لکھا گیا اور دوئم سیاسی اور ثقافتی موضوع پر مبنی افسانہ ہے۔ یہ دونوں اپنے مصنفین کے شہکار تخلیقات نظر آتے ہیں۔ پہلا افسانہ ذاتی اور ذہنی کرب کا آئینہ دار ہے۔ جبکہ

دوسرا قومی اور ثقافتی زوال کی عکس کشی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

بلوچی افسانہ سات دہائیوں سے زائد عرصے سے جدید بنیاد کے سفر کے بعد رفتار، مقدار اور معیار کی ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہوا ایک پرامید صورت حال کا نظارہ پیش کرتا ہے۔ واضح رہے کہ مندرجہ بالا سطور میں چند افسانوں کے حوالے پیش کیے گئے ہیں۔ تاہم افسانوں کی اکثریت شاہکاری نظر آتی ہیں۔ ان میں چند بین الاقوامی معیار کی صف میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ غنی پرواز کو بلوچی ادب میں تعداد کے اعتبار سے نہ صرف زیادہ افسانے لکھنے کا اعزاز حاصل ہے۔ بلکہ انہوں نے اس صنف ادب میں نت نئے تجربات کرنے کا شرف بھی حاصل ہے۔ جدید افسانوں کے تناظر میں انہوں نے خود کلامی سے لے کر سے رنگی تیکنیک پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔

اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں 2001 میں غنی پرواز کی کتاب "مرتگیں مردو ہچیں چم" بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، صباد شتیاری کی کتاب "ترانگانی ہنزہ" سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی اور رزاق نادر کی کتاب "زامریں زند" بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے، 2003 میں ناگمان کی کتاب "دار و اسپ" لبزانک پبلی کیشنز کراچی اور یاسین مجروح کی کتاب "جنتیں زند و دوزاہیں درد و غم" دوران پبلی کیشنز، جیوانی کی جانب سے، 2004 میں غوث بہار کی کتاب "کرکینگ" اور حفیظ حسن آبادی کی کتاب "پپی ایں گورہام" بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے، 2006 میں صبا دشتیاری کی کتاب "آس ءُ آسیب" سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی کی جانب سے، 2007 میں علی جان قومی کی کتاب "زرد و پادہ" ترژن لبزانکی مجلس، نذر آباد تمپ، مقبول ناصر کی کتاب "ماہکان و جنگ" گلام پبلی کیشنز گوادر، عباس علی زیمی کی کتاب "داس" عباس علی زیمی اکیڈمی، کراچی اور مراد ساحر کی کتاب "گرمیں ساہگ" گلام پبلی کیشنز گوادر کے جانب سے، 2008 میں حکیم بلوچ کی کتاب "دورش جتیں اروح" بلوچیہ پبلی کیشنز، کوئٹہ، ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی کی کتاب "مہرو تیاب" سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، عصا ہجار کی کتاب "موسے کیسانی تہا" نگور لبزانکی مجلس، بل نگور، علی ریمیں کی کتاب "دراندیہ" اور غلام گوری کی کتاب "بالشتدیں واہگ" بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، حنیف شریف کی کتاب "شپ ءَ کہ ہور گوارت" اور غنی پرواز کی کتاب "بندیں چم کہ پچ بنت" بلوچستان اکیڈمی تربت، منیر بلوچ کی کتاب "زرستر" کلکار پبلی کیشنز، کراچی اور عارف وفا کی کتاب "آتار" پبلی کیشنز، کراچی، 2009 میں نورل بلوچ کی کتاب "تنءِ

ہوشام "ٹوک آباد" پبلی کیشنز، اے آر داد کی کتاب "ورگے پچ پیت" بلوچستان اکیڈمی، تربت، ڈاکٹر علی دوست بلوچ کی کتاب "کاپر" قلات پبلی کیشنز، کوئٹہ، حکیم بلوچ کی کتاب "شہید ءِ شیشنی جگند" بلوچیہ لبزانکی پبلی کیشنز، کوئٹہ، حنیف ہمراز کی کتاب "بانی ءِ ترپے ارس" قاسم لبزانکی مجلس، مند، آدم علی کی کتاب "دپارء سنزد"، 2010ء میں منیر احمد بادینی کی کتابیں "ہزار ءِ پاسانی شپ" نیو کالج پبلی کیشنز کوئٹہ اور "شکیوت" بلوچستان اکیڈمی تربت، غنی پرواز کی کتاب "سرشپ مرگ" بلوچستان اکیڈمی تربت اور نثار احمد کی کتاب "بے زبانیں کتک" آجو پبلی کیشنز، کراچی کی جانب سے شائع ہوئیں۔

اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں یہ سفر مزید تیزی اختیار کر لیتا ہے اور اسی طرح 2011 میں ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی کی کتاب "شکل و زہر آپ" بلوچستان اکیڈمی، تربت، منظور بلوچ کی کتاب "جاتیک" گلکار پبلی کیشنز، کراچی اور منیر دوست کی کتاب "روچ گوارگ" گلشن پبلی کیشنز، کراچی، 2012ء میں رحشند ہاتاج کی کتاب "اندیل ابد ماتت" بلوچستان اکیڈمی، تربت، عزیز بگٹی کی کتاب "حرامانی کشار" بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، غنی پرواز کی کتاب "دل مہر مسافر منزل" جمشید پبلی کیشنز، تربت اور احمد عمر کی کتاب "نقش گندء انکبال کن ات" بلوچستان اکیڈمی، تربت، 2013ء میں محمد سعید قاضی کی کتاب "پچے جبر" آجو پبلی کیشنز، کراچی، منیر دوست کی کتاب "کوہ تو ءِ ہات" سچکان پبلی کیشنز، کراچی اور ابراہیم عابد میری کی کتاب "سالونکی ارمان" گلشن پبلی کیشنز، کراچی، 2014ء میں عندلیب گچکی کی کتاب "آزاتی ءِ روکیں چراگ" سچکان پبلی کیشنز، گوادر، اے آر داد کی کتاب "دریا ءِ کنا پیداک نت" اسٹین شنگار، کیچ، غلام کھوری کی کتاب "نامرجمیں کسر"، حنیف شریف کی کتاب "تیراں ونک" بلوچستان اکیڈمی، تربت، اصغر زبیر کی کتاب "کوہ نجان" رئیسی چاپ و شنگ، کراچی، ملا مراد کی کتاب "C11" سیا شنگار، پنجگور، نثار احمد کی کتاب "جمن" کوہ ڈگار لبزانکی مجلس، دشت کسر، عندلیب گچکی کی کتاب "روشن ءِ ارمان" سچکان پبلی کیشنز، کراچی، 2015ء میں علی دوست کی کتاب "منی ساہگ آدیکے" اسٹین شنگار، کیچ، اسلم تگرانی کی کتاب "کوچ ءِ رگ ات" ریگزار لبزانکی مجلس، گوادر اور منیر بادینی کی کتاب "کلشک" نیو کالج پبلی کیشنز، کوئٹہ، 2016ء میں محمد ابدال کی کتاب "چماں چکاتہ جنگیں والب" کوہ ڈگار لبزانکی مجلس، دشت کسر، زاہد رئیسی کی کتاب "بے کسء منی ءِ ان نیت" رئیسی چاپ و شنگ، کراچی، اصغر زبیر کی کتاب "ہور ءِ بُرزیں ترمپ" اسٹین شنگار، کیچ، منیر

مومن کی کتاب "لیلان" "الزم شنگکار کولوا"، ڈاکٹر طارق نجی کی کتاب "پہ شنگیں بان" "ملاقات فضل اکیڈمی، مستنگ اور سید حیات رحیم کی کتاب "آسمے اندیم انت جیلین وہ ادرة" "ڈاکٹر سکار لبزانکی گل، پسنی، 2017 میں رفیق چاکر کی کتاب "سوتک ءُ تہ ریک ءُ توار" "عزت اکیڈمی، پنجگور، اور عارف صمد کی کتاب "تیسرا نیں چیدگ" "سولم شنگکار، پیدان" 2018 میں بی ایم آزاد کی کتاب "چورائی گران انت" "ساچ اوبی جاگرد، امام روز کی کتاب "چراگ تنگ ءَ انت" "گوادر لبزانکی مجلس، دشت کمر" اور ارشاد زہیر کی کتاب "ایبرہ دزی" "علم و ادب پبلی کیشنز، کراچی، سلامر و بلوچ کی کتاب "زیدتی" 2019 میں عزت اکیڈمی پنجگور کی جانب سے شائع ہوئیں۔ طاہرہ احساس جتک کی کتاب "بزار رنگیں دنیا"، مہر اللہ مہر کی کتاب "مہرء چیدگ" "اصغر زہیر کی کتاب "رنگ مبارکان، دودھری پہ" 2019، عمر عثمان کی کتاب "شیکل سرا ایریں پُرواں" 2019، ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی کی کتاب "سماوریں یا گوات" اور شرف شاد کی کتاب "سفر و میر تگیں رہاں" 2020 میں انسٹیٹیوٹ آف بلوچیات کی جانب سے جبکہ غنی پرواز کی کتاب "دُ شنگیں واب ءِ تہ دُ شنگیں معنیٰ" اور ندیم بے وس کی کتاب "زردیں دیدگانی بوشام" 2021 میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے شائع ہوئی ہیں۔

حوالہ جات:

1۔ فضل بلوچ۔ 2021۔ بلوچی افسانے۔ دریافت ادب، جلد: 5، شمارہ: 18، 88 نیشنل بیروز، کلکتہ۔ ص 133

2۔ اصغر محرم۔ 2012۔ گچین تاک، آریک۔ بلوچستان اکیڈمی، تربت۔ ص۔ 264

3۔ عبداللہ جان جمالدینی۔ 1988۔ ادتاک بلوچی۔ ص۔ 25

4۔ ڈاکٹر واحد بخش بزدار۔ 2010۔ پاکستانی ادب (انتخاب شاعری و افسانہ۔ 1947-2008) اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد۔ ص۔ 16

5۔ مجاہد بلوچ۔ 2021۔ کتاب گنج۔ شعبہ بلوچی، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ

6۔ عرفان جمالدینی۔ 2021۔ کتاب شون۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

7۔ صبا دشتیاری۔ 2003۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 1۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

8۔ صبا دشتیاری۔ 2007۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 2۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

9۔ صبا دشتیاری۔ 2009۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 3۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

ناول نگاری

ناول کو بلوچی زبان میں "گدار" کہتے ہیں۔ ناولٹ کو "گدارک" اور ناول نگار کو "گدار نویس" کہتے ہیں۔ بلوچی ناول بھی اپنی سفر کا آغاز لگ بھگ نصف صدی قبل شروع کرتا ہے۔ اس صنف پر پہلی مرتبہ طبع آزمائی بلوچستان کے ساحلی علاقے گوادر سے نامور محقق، ادیب سید ظہور شاہ ہاشمی بیسویں صدی کے آٹھویں دہائی میں کرتے ہیں۔ وہ نازک کے نام سے ناولٹ لکھ کر بلوچی زبان میں ناول کی بنیاد ڈالتے ہیں۔ یہ ناول گوادر شہر، ساحل اور سمندر کے پس منظر میں روزگار کی مشکلات کے موضوع پر "سماجی حقیقت پسندی پر مشتمل ہے۔ یہ پہلا بلوچی ناول ہے جس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا جو کہ اکادمی ادبیات پاکستان نے شائع کیا جسے غوث بخش صابر نے ترجمہ کیا تھا۔

نازک کی حیثیت تاریخی ہے کیونکہ یہ بلوچی کا پہلا ناول ہے۔ جب بھی بلوچی زبان میں ناول کی بات ہوگی تو اس ناول کو فراموش کرنا ناممکن ہوگا اور اس کی مثال ضرور دی جائے گی۔ اس کے علاوہ یہ سید ظہور شاہ ہاشمی کی خالص بلوچی میں ادبی کاوش کی حیثیت سے پہچانا جائے گا۔ بلوچی فکشن پر جب بھی بات کی جائے گی نازک کی مثال دی جائے گی (1)۔ بلوچی کا دوسرا ناول 1985 میں عبدالستار پردلی کا "سوب" (فتح) ہے۔ جس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر شاہ محمد مری نے کیا۔

فقیر محمد عتیر کا ناول "نل ءِ توار" (بانسری کی آواز) تیسرا ناول ہے جو کہ 1987-2001 بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے شائع ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ناول نازک سے کئی سال قبل لکھا گیا لیکن مالی مجبوریوں کے باعث بعد میں چھپا۔ نازک چونکہ ایک ناولٹ تھا تو بلوچی کے پہلے ناول کا ٹائیٹل اگر اس ناول کو دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہئے۔ یہ ناول زندگی کے روزمرہ معاملات پر مبنی کہانی ہے جو تین حصوں پر مشتمل ہے۔ 1۔ سوتیلی ماں کی ظلم و ستم کے سبب بچے کا

گھر چھوڑ دینا۔ 2۔ انجان جگہ پر جانا اور وہاں پر اپنے لوگوں کے ساتھ نیا تعلق جوڑنا اور نزدیکی پیدا کرنا۔ 3۔ عائشہ کے ساتھ پیار و محبت کا تعلق جوڑنا شامل ہیں۔۔۔۔۔۔ اس تخلیق میں فقیر محمد منیر نے ضرب الامثال، اصطلاحات اور خالص بلوچی کو استعمال کر کے ناول کی خوبصورتی میں اضافہ کیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتا ہے کہ بلوچی ادب میں مکمل طور پر نہیں مگر ناول نویسی میں وہ پہلے مصنف ہیں جنہوں نے عورت اور ذات پات کے مسائل کو اجاگر کیا ہے (2)۔ چوتھا ناول "جہد و کاروان" (انقلابی قافلہ) تھا جسے محمد رضا نے لکھا اور 1989 میں شائع ہوا جو پہاڑی اور دیہی معاشرے کے موضوع پر مبنی سیاسی اور انقلابی ناول ہے۔

پانچواں اور چھٹا ناول منیر احمد بادینی کے ناول "ریکانی کلی ئے بلکے" (ریگستان میں ایک گاؤں) اور "بے کہ ماہ بکپیت" (چاند کو ڈھل جانے دو) ہیں۔ ناول اندر دیہی اور صحرائی معاشرے میں قحط سالی کے عنوان پر سماجی تخلیق ہے جبکہ اور دوسرا پشین کے پس منظر میں دہشت گردی اور حکومت کے کردار پر فلسفیانہ کاوش ہے۔ یہ دونوں کتب بالترتیب 1993 اور 1997 میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے شائع ہوئیں۔ منیر بادینی بلوچی ناول پر طبع آزمائی کرتے ہوئے اسے آسمان کی بلندیوں کی جانب لے جاتے ہیں۔

منیر بادینی نے بلوچی ناول کو زمین سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا ہے۔ خواہ خامیاں ہوں یا نہ ہوں مگر دو چار ناول کی تعداد کو سینچری تک پہنچانا غیر معمولی بات ہے۔ زبان و ادب کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی اور خدمت نہیں ہو سکتی۔ ایک اکیلے شخص نے اتنا کام اتنے مختصر عرصے میں کیا جو ادارے دہائیوں تک نہیں کر پاتے (3)۔

ساتواں ناول نامور استاد و ادیب غنی پرواز کا "مہرو ہو شام" (محبت کی پیاس) ہے جو بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے 2000 میں شائع ہوا۔ یہ ناول گوادر کے ساحلی شہر کے پس منظر میں محبت اور حقوق کے موضوعات پر سفری، رومانوی اور فلسفیانہ کاوش ہے۔

کوہ سلیمان کی وادی سے تعلق رکھنے والے حاجی خدا بخش بزدار کا "چھید ئغ" (مورچہ) بلوچی زبان کا آٹھواں ناول ہے جو کہ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے 2001 میں شائع ہوا۔ جو کہ قدیم اور آزاد ریاست چاغی کوہ کے پس منظر میں قوم دوستی، وطن دوستی اور مزاحمتی جدوجہد کے موضوعات پر تاریخی اور انقلابی تخلیق ہے۔

ب لوچی کا نواں ناول ڈاکٹر فضل خالق کا "ہر ساعت پچاس" (ہر لمحہ آزمائش) ہے جو بلوچی اکیڈمی کی جانب سے 2005 میں شائع ہوا۔ جو محبت، سمگلنگ اور بچوں کے اغوا جیسے موضوعات پر رومانوی حقیقت اور سماجیات پر مبنی شاہکار ہے۔ اسی طرح دسواں ناول غنی پرواز کا "شپ جتیں راہی" (شب زدہ مسافر) ہے جو سال 2007 میں بلوچی اکیڈمی کی جانب سے شائع ہوا۔ یہ ناول آواران کے پس منظر میں محبت، انسانی جیون کے مقصد و معانی پر مبنی رومانوی و تعلیمی تخلیق ہے۔

اسلم دوستین کا نواں ناول "سوتکال" بلوچی کا گیارہواں ناول ہے اور 2008 میں گام پبلی کیشنز، گوادر کی جانب سے شائع ہوا۔ جو پسنی اور اس کے گرد و نواح کو مد نظر رکھتے ہوئے تحقیق، وطن دوستی اور انسان دوستی کی بنیاد پر رومانوی، تاریخی اور سماجی کاوش ہے۔

منیر احمد بادینی کا ناول ٹرائلوجی "شال و گلیں بازار" (شال کا خوبصورت بازار) ہے۔ اس ٹرائلوجی کا پہلا ناول "بلان انت سنگ لالائی" (روشن ہے دیا انہوں کا) ہے۔ دوسرا "جوزیں جاور انی زوراکی" (ظالم صورت حال کی کلفتیں) اور تیسرا "بازبو آئی ہزار بو" (تازہ بو کی ہزاروں خوشبو) جو کہ بالترتیب بلوچی کے بارھواں، تیرھواں اور چودھواں ناول ہیں۔ 2008 اور 2009 میں شائع ہوئے۔

نذیر ناصر کا ناول "اگریچ" بلوچی کا پندرھواں ناول ہے جو بلوچی ادبی مجلس کی جانب سے شائع ہوا اور ناصر آباد تربت، ملتان کراچی اور سلطنت عمان کے پس منظر میں بے وفائی کے عنوان سے خود نوشت سوانح عمری ہے۔ جو 2009 میں شائع ہوا۔

اسی طرح بلوچی کا سترواں ناول حنیف شریف کا "بچکر وہ چل" (زوال کا پھول) ہے جو بلوچستان اور مسقط، عمان میں بلوچوں کے معاشرے کے کو مد نظر رکھتے ہوئے سماجی، سیاسی اور انقلابی تخلیق ہے۔ جو 2010-2013 میں ساہان، بلوچستان اکیڈمی تربت کی جانب سے شائع ہوا۔ منیر بادینی کے ناولوں کا تذکرہ آگے چل کر الگ سے کرتے ہیں۔

اس کے بعد بلوچی ناول نویسی میں ظاہر دیدار کا ناول "ہانی" 2010 میں گام پبلی کیشنز، گوادر، اسلم تگرانی کا ناول "قبر آماچیں گدان" 2011 میں آشار پبلی کیشنز، کراچی، غنی پرواز کا ناول "مہرو ہمراہی" جمشید پبلی کیشنز، تربت، اسلم تگرانی کا ناول "گلمات" 2013 میں آشار پبلی

کیشنز، کراچی، مولا بخش بہار کا ناول "ترا اتفاقی در" سچکان وچلی کیشنز، گوادر، ظاہر دیدار کا ناول "جیل" 2014 میں سچکان بچلی کیشنز، گوادر، عارف وفا کا ناول "بیس پچ" 2014 میں قاسم لبزانکی مجلس، مند سورو، علی جمعہ زامرانی کا ناول "بے راہیں منزل" 2015 میں بہار گاہ چاپ ءُ شنگ، حب، نثار احمد کا ناول "تتی" 2015 میں شنگکار زبان، غنی پرواز کا ناول "آس ءُ لوت کنان ات" 2016 میں بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، عارف وفا کا ناول "تلک ءُ گوک" 2016 میں کوہ ڈگار لبزانکی مجلس، دشت کسر، منظور دوست کا ناول "مات ءُ ہورو سرانت" 2016 میں اشتین شنگکار، کیچ، حیات شوکت کا ناول "بہرام ءُ نازی" اور شے برکت کا ناول "ماہکان" 2016 اور 2017 میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، جاوید ارمان کا ناول "زندمان ءُ زندان" 2017 میں عزت اکیڈمی، پنجگور، غنی پرواز کا ناول "ماہ ءُ سرار روچ ءُ جیر" 2017 میں بلوچستان اکیڈمی، تربت والے آر دواد کا ناول "سایگ ءُ واتر کنت" 2017 میں اشتین شنگکار، کیچ، فقیر محمد عنبر کا ناول "آروچ" 2018 میں عزت اکیڈمی، پنجگور، زاہدہ رئیسی راجی کا ناول "پادءِ چیرءِ زمین" 2018 میں رئیسی چاپ ءُ شنگ، کراچی، فقیر محمد عنبر کا ناول "چاگرد" 2018 میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ اور فقیر محمد عنبر کا ناول "ارزن ءُ شہار" 2018 میں ریدگ وچلی کیشنز، بلوچستان اور زاہدہ رئیسی راجی کا کتاب "توکہ زندئے دردرے" 2019 میں بلوچی اکیڈمی کی جانب سے، انسٹیٹیوٹ آف بلوچیا کی جانب سے عمر عثمان کی کتاب "سا کپتنزار تگیں ارس" اور 2022 شہید جلیل سنجرانی فاؤنڈیشن پنجگور کی جانب سے مجاہد بلوچ کی ناولٹ "ارواح ءِ چیسانت" شائع ہوئے۔

بلوچی ناول نگاری میں منیر احمد بادینی چمکتا ہوا ستارہ نظر آتے ہیں۔ جو اپنی پوری توانائی ناول نگاری پر مرکوز کر کے پے در پے ناول لکھتے اور چھپواتے رہے ہیں۔

منیر بادینی کا شمار ان ادبی ہستیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے بلوچی زبان وادب دونوں کی بھرپور آبیاری کی۔ ان کے ناول اور کہانیاں بلوچی ادب کی اعلیٰ مثالیں قرار دی جاتی ہیں۔ انہوں نے کسی مخصوص طبقے یا گروہ سے بالاتر ہو کر صرف اور صرف عوام الناس کے لئے عمدہ، معیاری اور تعمیری ادب تخلیق کیا جس کی بدولت انہیں بلوچ لکھاریوں میں وہ عوامی مقبولیت ملی جو اپنی مثال آپ ہے۔ بلوچی زبان میں یہ اعزاز صرف انہیں حاصل ہے کہ انہوں نے سو سے زائد ناول تحریر کر کے اپنی قدرت تخلیق کا بھرپور اظہار کیا(4)۔

منیر بادینی کے لکھے ہوئے ناولوں کے نام درج ذیل ہیں جن میں اکثریت بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، نیو کالج پبلی کیشنز، کوئٹہ، پاکلٹ ایجوکیشن پروڈکشن، لاہور، گام پبلی کیشنز، گوادر، سیچکان پبلی کیشنز، گوادر، فیصل بک ہاؤس، کوئٹہ، شال پبلی کیشنز، کوئٹہ، گل خان نصیر چیئر، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ وغیرہ جیسے اشاعتی اور ادبی اداروں کی جانب سے شائع ہوئے اور کچھ زیر اشاعت ہیں۔

1۔ ریکانی کلی ءِ بگے،(A village beyond sand)،2۔ بیلے کہ ماہ کیت (The waning moon)،3۔ شال ءِ گمیں بازار: بلان انت سکہ لاوانی،(Shal trilogy)،4۔ شال ءِ گمیں بازار: ہزاریں جاورانی زورا کی،(Shal trilogy)،5۔ شال ءِ گمیں بازار: ہزاریں آئی ہزار بہ،(Shal trilogy)،6۔ ایش تی زمین ایش تی آزمان،7۔ قرنانی قبریں ٹگہ،(Centuries wound)، 8۔ ایش گوں مراں لیب ئے،(The dance of death)،9۔ ارجم کہ آزندگ انت،(Happy! Who is alive)، 10۔ تہاریانی چنگ،(The children of darkness)،11۔ میری ءِ برج دیما انت،(The towers are visible)، 12۔ پنجمی پہنات،(Fifth dimension)،13۔ اے زند ترا برازیت،(This life suits him)،14۔ ہزار قرنانی ودار، (Centuries wait)، 15۔ بل کہ شپ آدار بکنت،(Let the darkness prevail)، 16۔ ہزاریں مزانی پند: بےکسیں بندر ءِ شوہاز،(The thousand miles journey:1)،17۔ بلّ گوشانی مرائیں نسل،(The extinct race)، 18۔ جتی بے جی،(In search of centre)، 19۔ چیف پروٹوکول افسر ءِ وان،(The dream of an officer)، 20۔ نچیں تاج نام نیست (Eternal Silence)، 21۔ من ءَ چش گڑ ءُ براں!،(Don't take me a hero)، 22۔ پوت گلی ءِ بلّی،(A man from "Poothglee")، 23۔ چلتن ءِ سائیگ دراں انت بلاں،(The shades of chiltan)، 24۔ کسی نادرانی جاہدی: کسّہ ءِ امر بادشاہ،(The story of a king)، 25۔ من مراں یک رند گڈ،(The both are mortal)، 26۔ چاردی دارءِ زندگانی، (Fouth life)، 27۔ جے

سیسراں آدیم وراو بیہوش انت ،(Those mad souls) 28۔ شپانک ءُ گرک
(The shepherd and wolf) 29۔ نیمیں کشتیں ساعت ،(Difficult
moment) 30۔ کلیت توار چہ ورگیب ءَ (The voices from behind) ۔
31۔ نہ کس کشیت نہ پادات ،(No victor no vanquished) ،
32۔ بگیں تو بیو ،(To be not to be) 33۔ بیا ودنہ بیا امریکا ،(Come life
come America) 34۔ مرگ ءِ جاوریں مہر ،35۔ واھگانی ساہ کندان ،(The
last serfam) 36۔ من حاک تو ہم حاک ،(To earth thou retrun) ،
37۔ صباء ہر کس زانت ،(Sabah is known to all) 38۔ سیاہیں گدان ہمرازینت
(The secrets of black tents) 39۔ سیم سرانی ساہگ ،(The
border) 40۔ سےوقی ووراں گردوزیر ،(Our heroes) 41۔ سدءِ ی روچانی دیار
(The land of windstorms) 42۔ اشپی برپ رشیت ،(The snow
at night) 43۔ جیمڑی ءِ ور کپت ،(The sun sat at Jimury) 44۔ بے
بندری ئیے بیست ،(The dispaced) 45۔ سگ ءِ سرگوست ،(The story of
dog) 46۔ دل آرام ءِ درد ،(The pain of Dilaram) 47۔ بانور ،(The
bride) 48۔ شپ ءِ چم ،(The eyes of darkness) 49۔ نوکیں ٹپ
سوچانی تہد ،(The new wounds) 50۔ ہون ءِ گوانک ،(The cry of
blood) 51۔ درچکانی ساہگ ءِ چیر ءَ ،(Under the shades of trees) ،
52۔ منی اے زندگی اوست ءَ ،(My life's last hope) 53۔ سارین مردءِ
روزنامک ،(Dairy of sane man) 54۔ پہ یانی پادت ،(Deception) ،
55۔ ازل تا ابد چپ ،(Infinite silence) 56۔ بےکشت ءُ دوزءِ ،(Exile and
kingdom) 57۔ سرہانگ ءِ سرشیگ ،(The hieghts) 58۔ بہار و طیفار
59۔ شانکاریں ،(The flood life of Mir Gul Khan Naseer) ،
شاری ،(Shari: The beauty) 60۔ ڈکال ،(Dought) ۔61۔ مہر ءِ پچار
62۔ تہرءِ جواب ،(In search of love) 63۔ (A bitter reply) ۔ ساے

(Rose on lips)، 96 ۔ زیرہ و بامرد و مرگ، (Heroes Death)، 97 ۔ جتین
آدم ءِ دل ءِ چم ۔1، (The eyes of a women's heart-1)، 98 ۔ جتین آدم
ءِ دل ءِ چم ۔2، (The eyes of a women's heart-2)، 99 ۔ جتین آدم ءِ دل
ءِ چم ۔3، (The eyes of a women's heart-3)، 100 ۔ جتین آدم ءِ دل ءِ
چم ۔4، (The eyes of a women's heart-4)، 101 ۔ ہزاریں مزلانی
چد:۲ حشمیں بندر ءُ انت ، (The thousand miles journey:2)،
102 ۔ ہزاریں مزلانی چد:۲ حشمیں بندر گوا انت، (The thousand miles
journey:3)، 103 ۔ ہزاریں مزلانی چد:۲ حشمیں بندر آزمانان انت ، (The
thousand miles journey:4)، 104 ۔ ہزاریں مزلانی چد:۲ حشمیں بندر جنگانی
سائگ ء (The thousand miles journey:5)، 105 ۔ ہزاریں مزلانی
چد:۲ حشمیں بندر یک گانے، یک وہب ، (The thousand miles
journey:6)، 106 ۔ شرگ گون گرب گونڈا مہارت، (The east meets
the west)، 107 ۔ مہرانی نوکیں پجار، (A new definition of love)،
108 ۔ بلیں مراد، (The razor's edge)، 108 ۔ پچ مہرانی سرجمی کدی بوت کنت،
(Can love ever be comleted)، 109 ۔ آخرزمان، (The
judgement day)، 110 ۔ محشر، (Suffering)، 16 ۔ بزگ گیا کہ برزخ،
(Purgatory)، 111 ۔ صوم صلوت، (Rituals)، 112 ۔ یک دست تگی، یک دست
تگی، (Histories hand)، 113 ۔ دل آبادگیں آباد، (Happy ever after)،
114 ۔ آبیل ءُ قابیل، (Abel and Cain)، 115 ۔ قانون پروشوکیں میلوک، (The
law breakers)، 116 ۔ رحیمہ، (Rahima)، 117 ۔ مہر ءِ بادگانی بندر، (The
children of love)، 118 ۔ لذت ءُ نوکیں مردم، (The pleasure
seekers)، 119 ۔ یک لازم کارے ءِ آزاتی ءِ بادشت، (An artists dreams of
freedom)، 120 ۔ صراط مستقیم، (The straight path)۔

121۔ گریٹ گیم ئے میراث، (We the children of great
game)، 122۔ رنگ، توار، بو، (Colours, Sound and smells)،
123۔ مبارک ایں آیات یا مبارکیں مستاگ، (The sacred versuse)،
124۔ اوباشتاں روچ نیست (The nights without a sun)، 125۔ گرم
سیل تچیت پہ کیب۔1 (The gentle flow of gremsale:1)، 126۔ گرم
سیل تچیت پہ کیب۔2 (The gentle flow of gremsale:2)، 127۔ سیاہ
سر (Meek and mild)، 128۔ دومانء تہم سرء مہلوک۔1 (The people
on the fringe of civilization:1)، 129۔ دومانء تہم سرء مہلوک۔2،
(The people on the fringe of civilization:2) 130۔ دومانء
تہم سرء مہلوک۔3، (The people on the fringe of
civilization:3)، 131۔ پہ شت گیں عہد جنگ، (Tretaforts
beterayed)، 132۔ یاتانی سوگات، (Themoses of memory)،
133۔ آساپ (Blow hot, blow cold)، 134۔ برزنگیں شہ پاگ (The
nude and naked)، 135۔ بار سوم (The storm)۔

مندرجہ بالا فہرست کے مطابق منیر بادینی سو سے زائد ناولوں کے ساتھ بلوچی ناول کی خوب آبیاری کرتے ہوئے ناول کی صنف کے صف اول کے چمکتے ستارے شمار ہوتے ہیں، جبکہ اس کے بعد غنی پرواز، فقیر محمد عنبر اپنے ناولوں کے ساتھ دوسرے اور تیسرے نمبر پر بلوچی زبان کے ناول نگار شمار ہوتے ہیں۔ اسی طرح خدابخش بزدار، حنیف شریف، ڈاکٹر فضل خالق، اے آر داد، حیات شوکت، علی محمد زامرانی، مولابخش بہار، زاہدہ رئیسی راجی، منظور دوست، محمد رضا، اسلم دوستین، طاہر دیدار وغیرہ نے بلوچی زبان میں ناول نگاری میں بھرپور طریقے سے اپنا جوہر قلم دکھاتے نظر آتے ہیں۔

اسی طرح دیگر زبانوں کے مشہور ناول ترجمہ کے ذریعے بلوچی ادب کا حصہ بنے۔ ان میں 1976 میں غوث بخش صابر نے "Ernest Hemingway" کے ناول "The old man and the sea" کو "پیر مرد و زر" کے نام بلوچی میں ڈھالا جو کہ تو کین دور

کے صفحات کی زینت بنا۔ اسی ناول کو برکھا بلوچ نے "پیر مرد و سارز" کے نام سے 2015 میں استین شنگکار کی جانب سے شائع کیا۔ یوں یہ سلسلہ اب تک جاری و ساری ہے اور چالیس کے لگ بھگ دیگر زبانوں کے ناول بلوچی زبان میں ڈھالے گئے۔

حوالہ جات:

1۔ اصغر کریم۔ 2012۔ گچین تاک، آزینک۔ بلوچستان اکیڈمی تربت۔

ص۔289

2۔ ایضاً۔ ص۔291

3۔ شاہ محمد مری۔ 2012۔ عہد نامہ۔ عوامی انسٹیٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز۔ ص۔43

4۔ ڈاکٹر واحد بخش بزدار۔ 2019۔ منیر بلوچ: فن و شخصیت۔ اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد۔ ص۔7

5۔ مجاہد بلوچ۔ 2021۔ کتاب گچ۔ شعبہ بلوچی، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ

6۔ عرفان جمالدینی۔ 2021۔ کتاب شون۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

7۔ صبا دشتیاری۔ 2003۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 1۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

8۔ صبا دشتیاری۔ 2007۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 2۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

9۔ صبا دشتیاری۔ 2009۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 3۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

ڈرامہ نگاری

ڈرامے کو بلوچی میں "کسانک" کہتے ہیں۔ ڈرامہ نویس کو "کسانکاراور کسانک نویس" اور ڈرامائی تشکیل کو "کسانگیری" کہا جاتا ہے۔ ہزاروں سال پہلے جب آمد و رفت کے ذرائع محدود تھے شائقین وسیاح دنیا دیکھنے کے لئے پیدل اور اونٹوں کے ذریعے سفر کرتے۔ پھر اپنے مشاہدات اور تجربات کو دلچسپ انداز میں کسی چوک، پنڈال یا محفل میں بیان کرتے جسے قصہ خوانی کا نام دیا جاتا تھا۔ پھر اس قصہ خوانی نے منڈیوں کی شکل اختیار کرلی۔ سوانگ پارٹیاں جیں جو شادی بیاہ، مختلف تہواروں اور جلوسوں میں باجوں کے ساتھ نکلتیں اور لوگوں کو تفریح فراہم کرتیں۔ اس طرح آگے چل کر اس نے ڈرامے کے جدید شکل اختیار کرلی۔

بلوچی قدیم ادب کلی طور پر شاعری میں ہے۔ ان اشعار کے مطالعے سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ بلوچی شعر یا نظم کے اندر ڈرامے کی وہ تمام صفات موجود ہیں جو کسی ڈرامے کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ کیونکہ بلوچی کلاسیکل ادب کی شاعری میں اکثر اشعار ایک کہانی یا ایک ڈرامہ نظر آتا ہے۔ لوک داستانوں کے کرداروں کا ایک دوسرے کے مد مقابل کھڑا ہونا، مجلس کرنا یعنی مکالمہ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ان کہانیوں میں دیومالائی اور مافوق فطرت کرداروں، مہر و محبت کی داستانوں اور رزمیہ اشعار میں ڈرامے کا عکس نظر آتا ہے۔ کیونکہ اس میں زندگی کے واقعات کی منظر کشی کی جاتی ہے۔ جب بلوچی زبان نے تحریری شکل پائی تو ان داستانوں کو بنیاد بنا کر ریڈیو، ٹی وی اور رسائل کے لیے بہت سے ڈرامے لکھے گئے اور اب تک لکھے جا رہے ہیں۔

اگر بلوچی کلاسیکی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں جنگی، عشقیہ و دیگر موضوعات کی شاعری ملتی ہے۔ جس میں ڈرامائی انداز اکثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک ہی شعر میں کردار ایک دوسرے سے مکالمہ کرتے ہیں اور جواب دیتے ملتے ہیں۔ ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں ایک

سے زائد کردار ہوں جو ایک دوسرے سے بات چیت کرتے دکھائی دیتے ہیں(1)۔

ڈرامہ شروع سے بلوچ دیہی ثقافتی سرگرمی کا حصہ رہا ہے۔ دیہات میں تقریباً ہر رات ڈرامہ ہوتا تھا۔ لائٹ، سپیکر یا ڈائیلاگ وغیرہ کوئی ضرورت نہ تھی۔ ہمارے ڈرامے خاموش بھی ہوتے تھے اور صوتی بھی۔ کردار انسانی بھی ہوتے تھے اور جانوروں کے بھی۔ مافوق الفطرت مخلوق بھی ہمارے ڈرامے کا حصہ رہی ہے۔ پانچ ٹی وی نے اس زرخیز سرگرمی کو زہر کا انجکشن دے دیا ہے۔ ہماری پوری کلاسیکل شاعری مکالماتی صورت میں ہے۔ مکالمہ عاشق و محبوب کے درمیان ہوتا ہے جو کہ رشتہ داروں کے درمیان، دوستوں اور دشمنوں کے درمیان اس کی ایک عمومی خاصیت رہی ہے۔ امتیازی بات یہ ہے کہ انسان اور جانور کے درمیان باقاعدہ مکالمہ موجود ہے۔ ہماری کلاسیکل شاعری میں سب سے اہم بات جو عالمی ادب میں کم ہی ملے گی وہ یہ کہ بلوچ کلاسیک میں بے جان کے ساتھ مکالمہ ہوتا ہے۔ تلوار اور جوان مرد کے درمیان باقاعدہ دو طرفہ مکالمہ صرف حمل کی شاعری میں ہی موجود نہیں۔ اس طرح کلہاڑی کے ساتھ مکالمہ حمل و جیئند کی داستان میں حسن پیدا کرتا ہے(2)۔

بلوچی زبان کے ابتدائی ڈرامہ نگاروں میں عبدالحکیم بلوچ، مراد آوارانی، بشیر احمد بلوچ، عطا شاد، نصیر شاہین، صورت خان مری، احسان اللہ مگسی، ایوب بلوچ، میر عاقل خان مینگل، منیر احمد بادینی، غوث بخش صابر، محمد بیگ بلوچ، سرفراز سلیم بلوچ کے نام آتے ہیں اور بعد ازاں ان ناموں میں رزاق نادر، ڈاکٹر فضل خالق بلوچ، عبدالخالق بلوچ، یوسف عزیز مگسی، ڈاکٹر علی دوست بلوچ، اے ڈی بلوچ، حنیفہ حسن آبادی، علیم مینگل و دیگر شامل ہیں۔ قدیم عشقیہ داستانوں کو بھی ڈرامائی تشکیل دی گئی جن میں شہ داد و مہناز، حمل و ماہ گنج، بیبرگ و گراناز، جانی و شہ مرید، مست توکلی، سمو بیلی اور چاکر و گہرام جیسی تاریخی کہانیاں شامل ہیں۔ مذکورہ قدیم کہانیوں میں ڈرامائی عنصر پہلے سے ہی موجود تھا جب ان کو حقیقی ڈرامے کا روپ دیا گیا تو عوامی پذیرائی اور مقبولیت انتہا کو چھونے لگے۔

بلوچی زبان کا پہلا اسٹیج ڈرامہ "شہناز" ساٹھ کی دہائی میں مراد آوارانی نے لکھا اور یہ پہلی مرتبہ 1958 میں مستونگ کے ایک ثقافتی جشن میں پیش کیا گیا اس سے قبل 1954 میں جب ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے بلوچی کے پروگراموں کا آغاز ہوا تو بلوچی میں ریڈیو کے لئے ڈرامے

لکھنے کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے اور بہت سے ڈرامہ نگار سامنے آئے۔ اسی طرح 1974 میں کوئٹہ سے ٹیلی ویژن نشریات کا آغاز ہوا تو بلوچی کے ڈرامے پیش ہونا شروع ہوئے۔ محدود دائرے کے باوجود بلوچی ڈرامے نے اس دوران خوب ترقی کی، ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے اس کی خوب آبیاری کا ذریعہ بنے۔ اب قومی الیکٹرانک میڈیا کے نئے تناظر میں بلوچی ڈرامے کے فروغ کے مواقع موجود نہیں ہیں جو ڈرامہ نویسی کے میدان میں مقابلے کا ماحول فراہم کر سکیں۔ نجی شعبہ میں تو مواقع ناپید ہی ہیں۔

ہماری نئی نسل نے محدود وسائل، ناسازگار حالات اور سہولیات کی عدم دستیابی کے باوجود اپنی زبان سے محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر اسٹیج ڈرامے، تھیٹر، مختصر دورانیے کی فلم بنا کر اس صنف کو دوام بخشنے کی کوشش کی ہے، اس کوشش میں طارق مراد، عمران ثاقب، ثنا بلوچی، جان البلوچی، جلیل بکیر کمالان بیرگ بلوچ، شاہنواز بلوچ، سرفراز بلوچ، جمال جہانگیر، ر۔ ر۔ گمنام، شاکر شاد، انور عیسیٰ، خیر جان نیئرل، عمر کیا، داد بلوچ، امجد بلیدی، سعید بلوچ، علی نواز، علی رند، انور غلام، نصیر حمدگال بلوچ، انور حسین۔ اے۔ ڈی۔ بلوچ، احسان شاہ، ذاکر داد، شاہ امین شمین، جمعت بلوچ، سراج بلوچ، وقار بلوچ، دانش بلوچ، ولی رئیس وغیرہ، قابل ذکر ہیں۔

اسٹیج ڈرامے، تھیٹر، فیچر فلم اور مختصر دورانیے فلم بنانے کے لئے باقاعدہ تربیتی ادارے نہ ہونے کے باوجود گوادر، تربت، پسنی، کوئٹہ اور کراچی کے نوجوان اپنے سیاسی سماجی، اخلاقی، ثقافتی مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش میں مصروف عمل ہیں۔ ان تھیٹر، مختصر دورانیے کے فلموں کے نام "بیاہ مرید"، "دوچاپی"، "توکئے"، "لیاری جہت پہت"، "وش دل"، "گنوک ءِ آدینک"، "نوکیں زند"، "نامحرم"، "شی"، "آزمان"، "جن مرید"، "Man without shadow" "شوم"، "دین اوا اسلام"، "استاد کہ عربی کنت"، "جن ءِ لوگ"، "یہ سے مَن سوال کنان"، "او عبداللہ"، "شوہاز"، "آزمان"، "سازگیر"، "بچ گو تئی نیئیں"، "نادراہ"، "گزگز"، "قندیل"، "من نامبر جوزنگ لوٹاں"، "دست پہ دست"، "دیوال" وغیرہ شامل ہیں۔

بلوچی ڈراموں میں نصیر شاہین کی کتاب "ڈرامہ 1980-2014" میں اثیر عبدالقادر شاہوانی کی کتاب "کہیں کسانک" 1993 میں غوث بخش صابر کی "نگرہ ورز"

1996 میں، عبدالخالق بلوچ کی دو کتب "مہرو آشوب" اور "انجیرپل" 1996 میں غوث بخش صابر کی "گوہر و در پش" 1997 میں اختر ندیم کی "بوشام" 1997 میں ڈاکٹر فضل خالق کی "میڈیا" 2000 میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے شائع ہوئیں۔ اسی طرح ڈاکٹر علی دوست بلوچ کے ڈراموں کا مجموعہ "برجب" 2004 میں نوائے وطن پبلی کیشنز، کوئٹہ، منیر احمد بادینی کی کتاب "انشپی سروز نامت" 2010 میں نیو کالج پبلی کیشنز، کوئٹہ اور عندلیب گچکی کی کتاب "بوناں پادریا" 2013 میں بلوچ رائٹس کونسل، کراچی اور سبزان مری کی کتاب "کسمانک ءَ بلوچی کسمانک" بلوچی اکیڈمی کی جانب سے 2019 میں شائع ہوئیں۔

حوالہ جات:

1۔ ڈاکٹر غفور شاد۔ 2014۔ بلوچی کا سیکل شاعری۔ بلوچستان اکیڈمی، تربت۔ ص۔ 62

2۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری۔ 2014۔ بلوچی زبان و ادب۔ گوشہ ادب، کوئٹہ۔

3۔ مجاہد بلوچ۔ 2021۔ کتاب گنج۔ شعبہ بلوچی، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ

4۔ عرفان بساریجی۔ 2021۔ کتاب شون۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

5۔ صبا دشتیاری۔ 2003۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 1۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

6۔ صبا دشتیاری۔ 2007۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 2۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

7۔ صبا دشتیاری۔ 2009۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 3۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

انشائیہ

بلوچی زبان میں انشائیہ کا آغاز بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں ہوتا ہے اور ابتدائی طور پر بلوچی زبان کے رسائل نے انشائیہ کے فروغ میں بھرپور کردار ادا کیا۔ انشائیہ کو بلوچی زبان میں "ریزانک" اور "ریزانک" کہتے ہیں اور انشائیہ نگار کو "ریزانکار" اور "ریزانکار"۔

بلوچی زبان کے ابتدائی انشاپردازوں میں صباد شتیاری، عیسیٰ گل، اکرم صاحب خان، زبیر جاوید، کبیر بلوچ، یاسین مجروح، صابر علی صابر کے نام آتے ہیں۔ نوے کی دہائی میں ڈاکٹر فضل خالق، ڈاکٹر ملک محمد طوقی، ناگمان، نصیر حمل، اشرف سرباز، عثمان توکل شامل ہوئے پھر یہ کارواں بڑھتا چلا گیا۔ اس قافلے میں زاہد آسکانی، امام بخش امام، نور خان بزنجو، حمل پرویز، عزیز پنشانی، حسرت جاوید، ارشاد زبیر، ماجد زبیر، ناصر سعد آبادی، شکیل شیہک، عبدالجبار غریب، اللہ بخش کرار، ظفر کریم، حسین وڈیلہ، صادق ہیروکی، اے آر بلوچ تو کے آبادی، ستار سیاہ، گلزار گچکی، اسحاق محمود و دیگر شامل ہوتے گئے۔ بلوچی انشائی ادب کے فروغ میں اولس بلوچی کوئٹہ، بلوچی لبزانک، بلوچی، آساپ، کارواں، بہار گاہ، تربیلہ، بر مش، سگار، سوغات سپکان، بلوچی زند، سنگت جیسے رسائل و جرائد نے اہم کردار ادا کیا۔ ان میں اکرم صاحب خان کا "سودو"، ڈاکٹر ملک محمد طوقی کا "سر آساپ و زلمانی"، صباد شتیاری کے "زبان"، "ریل ءِ ریل" اور "منی واہگ"، ڈاکٹر فضل خالق کا "کرسٹ"، کبیر بلوچ کا "اے مکران انت" اور عیسیٰ گل "پوترنے" کی تحریریں قابلِ ذکر ہیں۔

ان کے انشائیوں میں زندگی کے مظاہر و مناظر کو خوش فکری سے دیکھنے کی دعوت دی گئی۔ ان انشاپردازوں کے ہاں انشائیہ کی بعض خصوصیات بھی ملتی ہیں۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا اگر متذکرہ بالا انشاپردازوں کا ظہور نہ ہوتا تو اکیسویں صدی میں بلوچی انشائیہ کو اپنے لئے نئی اساس

تلاش کرنا پڑتی۔ انشائیہ کے متعلق صبا دشتیاری کی کتاب 2002 میں سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی اور سنیا خالق کی کتاب "نود شنزاں" 2017 میں بلوچی اکیڈیمی کوئٹہ کی جانب سے شائع ہو چکی ہیں۔

حوالہ جات:

1۔ مجاہد بلوچ۔ 2021۔ کتاب گنج۔ شعبہ بلوچی، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ

2۔ عرفان جمالدینی۔ 2021۔ کتاب شون۔ بلوچی اکیڈیمی کوئٹہ

3۔ صبا دشتیاری۔ 2003۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 1۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

4۔ صبا دشتیاری۔ 2007۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 2۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

5۔ صبا دشتیاری۔ 2009۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 3۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

تنقید نگاری

تنقید نگاری کو بلوچی میں "شر گدری، نگد اور نگد کاری"، تنقید یا (تنقیدی تبصرہ) کو "نگد اِنک" نقاد کو "نگد کار" اور تنقید نگاری کو بلوچی میں "شر گدری اور نگد کاری" کہتے ہیں۔ تنقید نگاری ہی ادب میں نظریہ سازی ہے۔ ادبی تخلیق کو جانچنے اور پرکھنے، ان کے خوبیوں اور خامیوں کی عکس نگاری کیے بغیر ادب ترقی کے منازل طے نہیں کرتا بلکہ شتر بے مہار کی طرح جس طرف چاہے منہ اٹھا سکتا ہے۔ اس لئے جدید ادب میں تنقید کو انتہائی اہمیت دی گئی ہے۔ یوں تنقید ادب میں ایک علم اور صنف کے طور پر شامل ہے۔ تنقید نگار اس صنف کے اصول، قوانین و لوازمات اور اسلوب کے ساتھ تخلیق کاروں کے ادبی شہ پاروں پر باریک بینی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ جس سے نہ صرف تو ادب کو فروغ ہوتا ہے بلکہ تخلیق کار کے لئے ذہنی، فکری اور شعوری سفر کی نئی راہیں بھی متعین ہوتی ہیں۔

بلوچی ادب میں شر گدری رسائل و جرائد میں تبصروں سے شروع ہوتی ہے جو بیسویں صدی کے وسطی دور میں دکھائی دی ہے۔ تنقید نگاری کی ابتدا میں کریم دشتی، امان اللہ گچکی، سید ظہور شاہ ہاشمی، عبدالخالق بلوچ، میر عاقل خان مینگل، عبداللہ جان جمالدینی، ملک محمد طوقی، صورت خان مری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد اس قافلے میں محمد صدیق آزات، عطا شاد، ج۔ ص۔ امیری، غوث بخش صابر، صیاد شتیاری، عبدالحکیم بلوچ، عبدالصمد بلوچ، بیگ محمد بیگل، عبدالرحمن پہلوال، ڈاکٹر فضل خالق، عنایت اللہ قومی، غنی پرواز، سلطان نعیم قیصرانی، شے رگام، ڈاکٹر عبدالخالق خالد، اے آر شہزاد، ع۔ ش رشتی، ڈاکٹر علی دوست بلوچ، یوسف عزیز گچکی، اصغر علی آزگ، عبدالسلام عارف، عظیم آزگ، اثیر عبدالقادر شاہوانی، منیر احمد بادینی، اکبر بارکزئی، عبدالحمید ایران نثراد، زینت ثنا بلوچ، اے آر داد، صبیحہ کریم، آنسہ فوزیہ بلوچ،

عبید شاد، غلام فاروق بلوچ، طاہر حکیم، محمد رفیق عادل دشتی، منیر مومن، رزاق نادر، یانک م مینگل، الٰہی بخش دیدگ، نور خان بزنجو، ساجد نور بلوچ، ڈاکٹر ناگمان، شے چراگ، ولیل بلوچ قلگی، ملک دینارزئی بلوچ اور حسن مراد وغیرہ شامل ہو گئے۔

کریم دشتی نے اپنے دور کے شعرا میر گل خان نصیر، قاضی عبدالرحیم صابر اور آدم حقانی کے شعروں پر تنقید اور محمد حسین عنقا، سید ظہور شاہ ہاشمی اور عطا شاد کی شعری خوبیوں پر قلم کشائی کی۔ کریم دشتی کے متعلق غوث بخش صابر لکھتے ہیں کہ "کریم دشتی ایک اچھے شاعر اور ایک بالغ نظر محقق و مدبر انسان تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے تنقید کے میدان میں قدم رکھا اور " شرگداری" مرتب کر کے بلوچی کے بڑے بڑے سخنوروں کو ہدف تنقید بنایا۔ ان کے اعتراضات کا جواب آج تک نہیں ملا۔ اس لحاظ سے کریم دشتی کی تنقید کو ایک طرح سے درجہ سند حاصل ہے۔ شعر انہوں نے بہت کم کہے مگر جتنے شعر دستیاب ہیں وہ مروجہ شعری سطح سے بلند ہیں۔ ان کو انگریزی، عربی، فارسی، اردو زبانوں پر عبور حاصل تھا اور ایک حوالہ ایسا بھی ملتا ہے جس میں ظاہر ہوتا ہے کہ کریم دشتی مندرجہ بالا زبانوں میں شعر موزوں کیا کرتے تھے اگرچہ راقم کی نظر سے ایسا کلام ابھی تک نہیں گذرا۔ انہوں نے بلوچی ادب کی مختلف اصناف پر بلوچی میں ایک کتابچہ " لوزانک " بھی شائع کرایا جو اب نایاب ہے"(1)۔

کریم دشتی کی کتاب "لوزانکی شرگداری" (ادبی تنقید)، 1963 میں زمانہ پرنٹنگ پریس کوئٹہ سے شائع ہوئی۔ پھر بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کے جانب سے میر عاقل خان مینگل کی "لوزانکی ایرادگیری" (ادبی تنقید)، 1990 میں، غنی پرواز کی "لبزانکی شرگداری" (ادبی تنقید)، 1997 میں، غوث بخش صابر کی کتاب "نگدکاری" (تنقید)، 1997 میں اور واحد بخش بزدار کی کتاب "شاہیم" (تراز) 2016-1997 میں بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ کی جانب سے شائع ہوئے۔ صبا دشتیاری کی کتاب "ماگریں وانگ" 1999 میں سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی، اصغر علی آزگ کی کتاب "پور" 2001، آزات جمالدینی اکیڈمی، کراچی، صدیق آزات کی کتاب "ستاپیں تران" 2017-2002 میں سید لبزانکی مجلس، ڈاکٹر ناگمان "نگدانک" (تنقید)، 2006 میں اور رزاق نادر کی کتاب "رنگانی رگام" 2007 میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ سے آرواد کی کتاب "گپ روان کنت" (بات جاری ہے)، 2008 میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ میں مقبول نادر کی

کتاب "ماہکانی تران" 2008 میں گام وچل پبلیکیشنز، گوادر، غنی پرواز کی کتاب "فکشن ءِ آئی ءِ ٹیکنیک" 2009 میں بلوچستان اکیڈمی، تربت، اے آر داد کی کتاب "دل ءِ بلین" 2012 میں سچکان وچل پبلیکیشنز، گوادر، غنی پرواز کی کتاب "تو کیں راہ" 2013 میں بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، اے آر داد کی کتاب "شرگداری بلوچی شرگداری" 2014/2012 میں سچکان وچل پبلیکیشنز، گوادر اور اسٹین شنکار، کیچ، اے آر داد کی کتاب "بیالیراتک ءُ سراکپ جنیں" 2014 میں رژن فاؤنڈیشن، بلیدہ، حکیم بلوچ کی کتاب "لیراتک ءُ شرگداری" 2014 میں بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، رحمن مراد کی کتاب "نزد" 2015 میں بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، اے آر داد کی کتابیں "ازم ساچشت معنا" 2015 میں، "تبشنگیں تاک۔ اولی" 2016 میں، "تبشنگیں تاک۔ دومی" 2017 میں اسٹین شنکار، کیچ، "بزگیں آسمان" 2015 میں، ازم شنکار، کولواہ، "من چہ جیڑاتک" 2017 میں سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی اور رحیم مہر بلوچ کی کتاب "ساچگ ءِ باتنت" 2017 میں سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی، سعید عزیزاللہ کی کتاب "شرگداری چی ءَ" 2019 میں عزت اکیڈمی پنجگور اور 2020 میں انسٹیٹیوٹ آف بلوچیا، اشرف شاد کی کتاب "چراغ ءِ مجاہدت" 2019 اور قاسم فراز کی کتاب "اے آر داد ءِ تبشنگیں تاک ءُ پہ" 2020 میں انسٹیٹیوٹ آف بلوچیا کی جانب سے شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ بلوچی زبان کے مختلف رسائل و جرائد میں ان گنت تنقیدی مضامین اور تبصرے شائع ہوتے رہے ہیں۔

حوالہ جات:

1۔ مجاہد بلوچ۔ 2021۔ کتاب گنج۔ شعبہ بلوچی، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ

2۔ عرفان احمد بیگ۔ 2021۔ کتاب شون۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

3۔ صبا دشتیاری۔ 2003۔ بلوچی زبان ءُ لبزانک۔ 1۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

4۔ صبا دشتیاری۔ 2007۔ بلوچی زبان ءُ لبزانک۔ 2۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

5۔ صبا دشتیاری۔ 2009۔ بلوچی زبان ءُ لبزانک۔ 3۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

ترجمہ نگاری

ترجمے کو بلوچی میں "رجانک" جبکہ ترجمہ کرنے والے "رجانکار" کہتے ہیں۔ ترجمہ کی تاریخ بہت پرانی ہے اور یہ دنیا کی تمام قوموں اور زبانوں اور ان کے ادب میں نظر آتا ہے۔ صرف لفظ و بیان کو تبدیل کرنا ترجمہ نہیں ہوتا بلکہ ترجمہ ایک فن ہے جو ایک ماحول کے بیان کو دوسرے ماحول میں تبدیل کر کے اس طرح سے پیش کرنا ہے کہ جسے قاری پڑھے تو اسے اپنائیت محسوس ہو۔ ترجمہ میں دو قسم کی معلومات، مہارت کی طلب گار ہوتی ہے۔ دوسری زبان کو جاننے اور اسے اپنی زبان میں تبدیل کرنے کی مہارت۔ ترجمہ نگاری بھی بلوچی زبان و ادب کی تاریخ میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ بلوچی ادب میں تحریر کے ابتدائی دور سے ادب کی مختلف اصناف کے تراجم کے کا جو کام ہوا وہ قابل ستائش ہے۔ تاہم اس کی طرف توجہ کی مزید ضرورت ہے۔

انیسویں صدی میں جب بائبل کا بلوچی ترجمہ ہوا تو یہاں پر عیسائیت کے فروغ کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے اس کا راستہ روکنے کے لئے مکتبہ درخانی قائم ہوا۔ مکتبہ درخانی نے اسلامی کتب کی عربی سے بلوچی زبان میں تراجم کی ابتدا کی۔ مولوی حضور بخش جتوئی نے عربی کتب کتاب قدوری، شمائل شریف، خلاصہ کیدانی، منیت المصلیٰ، روضتہ الاحباب، حکایت صادقین، حکایات عجیبہ، خاکساری فریب، ہدایت ابدی، اور اصول الصلاۃ وغیرہ کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کا بلوچی میں ترجمہ کیا۔

بیسویں صدی بلوچی زبان میں ترجمہ نگاری کا باقاعدہ آغاز ماہنامہ "اومان" سے شروع ہوتا ہے۔ یہ غیر ملکی افسانہ عبدالصمد امیری کا "پشومانیں جنین" کے نام سے شائع ہوا جو روسی ادیب میکسم گورکی کے افسانوں میں سے ایک تھا۔ یہ افسانہ ماہنامہ "اومان" کے مارچ 1952 کے شمارے میں شائع ہوا(1)۔

بیسویں صدی کے پانچویں دہائی کے اواخر میں میر شیر محمد مری، عبداللہ جان جمالدینی، امان اللہ امانی جمالدینی، اکبر بارکزئی، نسیم دشتی، عبدالصمد امیری، محمد اسحاق بلوچ، وغیرہ اس میدان میں نظر آتے ہیں۔ تراجم کے اس کارواں میں ساٹھ کی دہائی میں مراد ساحر، عبدالرحیم امیری، محمد اسحاق درازئی، گوہر ملک، رشیدہ مینگل، فاطمہ مینگل، قاضی عبدالرحیم صابر، عزیز بیٹکانی، صدیق آزات، حاجی محمد جمالی، مولوی خیر محمد ندوی، مولانا عبدالصمد سربازی، طاہر محمد خان، کریم دشتی، محمد حسین عنقا، کامل القادری، میر گل خان نصیر، یمین سلام، عطاشاد وغیرہ شامل ہیں۔ ستر کی دہائی میں ہمیں غلام محمد شاہوانی، اختر ندیم، اکرم صاحب خان، رحیم بخش خاموش، ساجد بزدار، عزیز محمد بگٹی، یار محمد یار، غنی نقش، عبدالمالک بلوچ، بخشی ایم بلوچ، عبدالرحیم ظفر، الفت نسیم وغیرہ اور اسی کی دہائی میں بشریٰ ملک، قیوم سربازی، عبدالقادر اشیر، اسماعیل امیری، نعمت اللہ گچکی، حکیم بلوچ، غوث بخش صابر، انور قاضی وغیرہ دکھائی دیتے ہیں یوں قافلہ بڑھتا جاتا ہے۔ اس میں ڈاکٹر فضل خالق، اے آر داد، عبدالصبور بلوچ، ڈاکٹر علی دوست، عبدالسلام عارف، عبید شاد، عبدالخالق خالد، واحد قیصرانی، صابر ناگمان، عطاء اللہ قطانی، ستار میاہ، غلام مصطفیٰ میروانی، چراگ لاشاری، اصغر علی آزگ، ابراہیم عابد، فضل کریم قادر، رزاق نادر، کفایت بلوچ، میر جان میر، بدل خان، منیر احمد بلوچ، صادق مراد، نور خان بزنجو، رؤف راز، چاکر علی ابرار، غلام قادر بزدار، منیر مومن، جمیل امام، نور محمد نور، محمد شیر دل بلوچ، ر۔ ع۔ دشتی، میر انور میر، مولا بخش حبیب، صادق تموری، عزیز کلمتی، منظور بسمل، محسن بالاچ، دلیل بلوچ گچکی، شرف شاد، اے آر داد، برکھا بلوچ، علی گوہر، فدا احمد، اسحاق خاموش، عبدالستار بگٹی، عبدالواحد بندیگ، یزدان صباہ، چندن ساچ، قندیل بلوچ، سید رئیسی، وحید عامر، ہیرک بلوچ، نجیب قاضی، ابرا یاسمین، عزیز مہر، عصا بہار، شعیب شاداب، کریم تمل، میران رند و دیگر مترجمین افسانہ نگاری، ناول نگاری، ڈرامے و دیگر موضوعات میں نامور یورپی، مغربی، روسی، برصغیر کے مصنفین کے شہ پاروں کو بلوچی ادب کا حصہ بناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس کے علاوہ بلوچی زبان میں موجود تاریخ کے مختلف شہ پاروں کے بھی اردو و دیگر زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں۔ عبدالغفار ندیم نے سردار خان بلوچ کی کتاب "دی گریٹ بلوچ" کا ترجمہ کر کے چاکر اعظم کے نام سے 1988 میں شائع کیا۔ میر شیر محمد مری کی کتاب "بلوچی

کنسیں شاعری" کا ترجمہ "بلوچی زبان و ادب" کے نام آغا نصیر احمد زئی اور پیر محمد زبیرانی نے بلوچی اکیڈمی کی جانب سے شائع ہوا۔ محمد حسین عنقا بلوچ نے اپنی شاعری کا ترجمہ کیا۔ میر گل خان نصیر نے بلوچی عشقیہ کہانی، بلوچی رزمیہ کہانی، بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی اردو میں تحریر کر کے گرانقدر اضافہ کیا۔ جام درک کے کلام در چین کا ترجم میر مٹھا خان مری نے کیا جسے اکادمی ادبیات پاکستان نے 1987 میں شائع کیا۔ اسی طرح میر گل خان نصیر کے شعری مجموعے "شنبلاک" اور "ہون و گوانک" اردو ترجمے کے ساتھ شائع ہوئے۔ "تھوڑا سا پانی" غنی پرواز کے بلوچی افسانوں کا ترجمہ ہے۔ اسی طرح افضل مراد کی کتاب "انجیر کے پھول" بلوچی، براہوی اور پشتو افسانوں کے تراجم ہیں۔ مولانا عبدالصمد سربازی نے کلام مجید کے 17 پاروں کا ترجمہ کیا جسے ماہنامہ سوغات نے شائع کیا۔ مولوی خیر محمد ندوی نے نماز حنفی اور بچوں کے نام سے اسلامی معلومات پر بھی دو کتابچے ترجمے کیے۔

سردار خان بلوچ نامور محقق ہیں، انہوں نے بھی بلوچی کلاسیکل شاعری کا "لٹریری ہسٹری آف بلوچز" کے نام سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ ان کے ترجمے کا معیار اعلیٰ پایے کا قرار دیا جاتا ہے۔ اس کو جب قاری پڑھنے لگتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے پر لطف شاعری کے اصل حقیقی ذائقے سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔

محمد حسین عنقا نے نہ صرف اپنی شاعری کا ترجمہ کیا بلکہ انہوں نے "گلستان سعدی" کا بلوچی میں ترجمہ کیا۔ جسے بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے 1975 میں شائع کیا۔ اسی طرح پیر محمد زبیرانی نے "کریما سعدی" کا بلوچی میں ترجمہ کیا۔ اس کو بلوچی اکیڈمی نے 1978 میں شائع کیا۔ میر گل خان نصیر نے آخوند محمد صدیق کی جانب سے مرتب شدہ "تاریخ خوانین قلات" کا ترجمہ کیا۔ اسی طرح انہوں نے 1916 میں انگریز افسر جنرل ڈائر کی لکھی ہوئی کتاب "دی ریڈرز آف دی سرحد" کا ترجمہ کیا۔ جو کہ "بلوچستان کے سرحدی چھاپہ مار" کے نام سے شائع ہوا۔ میر گل خان نصیر نے فیض احمد فیض کی کتاب "سر وادی سینا" کا بلوچی منظوم ترجم "سینائی گچک" کے نام سے کیا۔ انہوں نے نامور صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام سے بلوچوں کے متعلق کچھ حصے کو "شاہ لطیف گوشیت" کے نام سے ترجمہ کیا جسے بلوچی اکیڈمی نے 1983 میں شائع کیا۔

عطا شاد اور عین سلام نے بلوچی لوک گیتوں کا ترجمہ کر کے اردو میں "درین" یعنی

قوس قزح کے نام سے بلوچی اکیڈمی کی جانب سے 1966 میں شائع کروایا۔ عطا شاد نے بلوچی عشقیہ داستان "لعل و گرانناز" کا منظوم ترجمہ کیا۔

عبدالرحمن پہلوال بلوچی ادب کے نامور لکھاری ہیں۔ انہوں نے بھی بلوچی ادب میں تراجم کے میدان میں اچھا کام کیا ہے۔ بلوچی شاعری کا پشتو اور فارسی زبانوں میں ترجمہ کیا ہے اس کے علاوہ بلوچی ادب اور تاریخ سے متعلق متعدد کتب (پشتو اور فارسی) کے ترجمے کئے۔ گل خان نصیر کی کتاب "داستان دوستین و شیرین" کا منظوم پشتو ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ کمیونسٹ مینی فسٹو کا بلوچی ترجمہ کیا۔

ڈاکٹر شاہ محمد مری نے بھی ترجمہ نگاری میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور اب کر رہے ہیں۔ انہوں نے بلوچ مصنف عبدالستار پُردلی کے بلوچی ناول "سوب" کا اردو ترجمہ "گندم کی روٹی" کے نام 2003 میں کیا جو قلات پبلیشرز کوئٹہ کی جانب سے شائع کیا گیا۔ انہوں نے نامور بلوچ خاتون لکھاری گوہر ملک کے بلوچی افسانوں کو اکٹھا کر کے اردو میں "بلوچ نے مجھے دھکا دیا" کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا۔ شاہ محمد مری نے بچوں کے لئے عالمی، شہرت یافتہ ادیبوں کی کچھ کہانیاں کے بھی بلوچی میں ترجمے کئے۔ میکسم گورکی کے مشہور ناول "ماں" کرسٹوفر کاڈویل کی "لبرٹی" کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز کی لکھی ہوئی کتاب کمیونسٹ مینی فیسٹو، جان ریڈ کی کتاب "ٹین ڈیز دیٹ شاک دی ورلڈ" کو بلوچی میں "جہاں جنبیں دو روش" کے نام سے ڈھالا، پلیخانوف کے مقالے کو "تاریخ ءَ تہا فرد ءِ کرد" کے نام سے ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ کارل مارکس کی تصنیف "ہیژدہی بروملیئر" خلیل جبران کتاب "دی پرافٹ" کا اردو ترجمہ کیا۔ شاہ محمد مری کلاسک عالمی ادب کو ایک منظور شدہ منصوبے کے تحت بلوچی میں ڈھال رہے ہیں۔ وہ تراجم سیریز کے ذریعے نامور لکھاریوں کے فن پاروں کو بلوچی ادب کا حصہ بنا رہے ہیں جو قابل ستائش عمل ہے۔

غوث بخش صابر نے بھی ترجمہ کے میدان میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے سید ظہور شاہ ہاشمی کے بلوچی زبان کے پہلے ناولٹ "نازک" کا اردو ترجمہ کیا جسے اکادمی ادبیات پاکستان نے شائع کیا۔ امرتا پریتم کے ناول "کورے کاغذ" کا بلوچی ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ توکلی مست دیگر عشقیہ داستانوں کو بلوچی زبان سے اردو میں ترجمہ کیا اور حسن عسکری کی کتاب "

سیستان و بلوچستان" کا اُردو میں ترجمہ کیا اس کے علاوہ لوک ورثہ کے جانب سے پاکستان ثقافتی انسائیکلوپیڈیا کا بلوچستان ثقافت کا حصہ اس نے ترتیب دیا اور دیگر لاتعداد کتب کا ترجمہ کیا۔ اللہ بخش بزدار نے بلوچی کے نامور شعراء گل خان نصیر اور آزات جمالدینی کے کچھ منتخب کلام کو اُردو میں منظوم کیا۔ انہوں نے فیض احمد فیض کی چند نظمیں بلوچی میں ڈھال دیں۔ اسی طرح غنی پرواز، ڈاکٹر فضل خالق، ڈاکٹر یزدان صبا، غوث بہار، عبدالحکیم بلوچ، حفیظ حسن آبادی، غوث بخش صابر، اے آر داد اور شرف شاد نے بھی تراجم میں کردار ادا کیا۔ احادیث نبویؐ کے تراجم پر مبنی ڈاکٹر ابوالقاسم عیسیٰ نے "اربعین عیسیٰ" کے نام سے شائع کرائی۔ آغا میر نصیر خان احمدزئی کی "رسالت معاب و نسب نامہ مبارک" نیشنل ہجرہ کونسل اسلام آباد نے شائع کی۔ میر مٹھا خان مری کی تالیف سیرت النبی محمد فخرو مطبوعات اسلام آباد نے شائع کی۔ جبکہ فیملی پلاننگ ایسوسی ایشن نے "کلام صوفیا" میں جو پاکستان کی چاروں زبانوں کے تراجم ترتیب دیئے جس کا بلوچی حصہ بشیر احمد بلوچ نے ترجمہ کیا۔

اسی طرح بیسویں صدی کی چھٹی دہائی سے تراجم کی کتابوں کی تفصیل کے مطابق سید ظہور شاہ ہاشمی کی کتاب "یک رئی دپن" 1954 میں بہائی چھاپ وشنگ دیوان، کراچی، سید ظہور شاہ ہاشمی کی کتاب "جز عم" 1962-2014 میں ندکار چھاپ وشنگ، کراچی و سید ہاشمی، اکیڈمی، گوادر، عبداللہ جان جمالدینی کی کتاب "گمگاری ہوار ؤ نیزمند" 1971-2003 میں، غوث بخش صابر کی کتاب "گلزار" 1973-2015 میں اور محمد حسین عنقا کی کتاب "گلستان سعدی" 1975 میں بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، شیر عبدالقادر کی کتاب "قلندر اعظم و گشتانک" 1977 میں بارڈر پبلسٹی آرگنائزیشن، کوئٹہ، پیر محمد زبیرانی کی کتاب "کریما سعدی" 1978 میں بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، مولانا محمد ابراہیم دامنی کی کتاب "کتاب الایمان العقائد" اسحاقیہ چھاپ جاہ، جونا مارکیٹ، کراچی، گل خان نصیر کی کتاب "سینائی و کیچگ" 1980-2015 میں قلات پبلی کیشنز، کوئٹہ و گل خان نصیر چیئر، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ، احمد علی آزاد کی کتاب "اسلام و بنیادی اصول" 1980 میں اسحاقیہ چھاپ جاہ، جونا مارکیٹ، کراچی، قاضی عبدالرحیم صابر کی کتاب "شیر و شکار" 1980 میں بلوچی ادبی بورڈ، کراچی، مفتی احتشام الحق آسیا آبادی کی کتابیں "تعلیم اسلام" اور "بیاج" 1980 اور 1981 میں صدیقی ٹرسٹ، کراچی،

شکراللہ کی کتاب "بیکاری" ، عزیز بگٹی کی کتاب "پاکستان و بسہ"، منیر احمد بلوچ کی کتاب "نادیکیں مسلمان"، ملک محمد پناہ کی کتاب "ہواریں زندمان" اور انور ساجدی کی کتاب "لس گروکیں بیاری" 1982 میں بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، گل خان نصیر کی کتاب "شاہ لطیف گوشیت" 1983-2014 میں بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، غلام فاروق بلوچ کی کتاب "آشوب" 1983 میں بلوچی بزاکی دیوان، کراچی، میر مٹھا خان مری و غوث بخش صابر کی کتاب "من پاکستانی آں" 1985 میں گوشہ ادب کوئٹہ، فضل خالق کی کتاب "لیمین گنج" 1985-1999 میں، ابوالقاسم مینگل کی کتاب "اربعین مینگل" 1985 میں بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، غوث بخش صابر کی کتاب "دو شششیں کیف" 1986 میں شوہاز پبلی کیشنز، کوئٹہ، محمد بیگ بیگل کی کتاب "سنی برات" اور نادر شاہ عادل کی کتاب "علامہ اقبال" 1988 میں قائداعظم اکیڈمی، کراچی، علی رئیسی کی کتاب "برلن وچاروک" 1988 میں، محمد بیگ بیگل کی کتاب "قائداعظم و گشتانک" 1990 میں قائداعظم اکیڈمی، کراچی، عبدالغفور شاکر کی کتابیں "بے مژتیں بادشاہ" اور "انسان و بیج" 1991 میں، مولا بخش کی کتاب "لاپ ءُ رچگ ءِ بیاری" 1993 میں کلاکوچ کوچنگ سروس، کراچی، گلزار خان مری کی کتاب "مہرانی چہر" 1984 میں اکادمی ادبیات پاکستان، عبدالغفور شاکر کی کتابیں "حضرت موسیٰ: توریت" اور "توریت شریف" 1994 میں پاکستان بائبل سوسائٹی، لاہور، غلام یٰسین بلوچ کی کتاب "سہریں صباہ" 1996 میں پاک نیوز ایجنسی، تربت، اختر ندیم و غوث بخش صابر کی کتاب "شد گیں سنگ" 1996 میں اور غوث بخش کی کتاب "ساد گیں تاک" 1996 میں ہی بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، غوث بخش صابر کی کتاب "1996 میں شائع ہوئے اور فضل خالق کی کتاب "میڈیا" 2000 میں بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ کی جانب سے شائع ہو کر قارئین تک پہنچیں۔

اسی طرح اکیسویں صدی میں اس کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور اس کی پہلی دہائی میں تکیم بلوچ کی کتاب "کاغدت"، ماما بخش امام کی کتاب "آپیتا تجلی" اور واحد بزدار کی کتاب: شعر و ایر او" 2001 میں بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، فضل خالق کی کتاب "گرو سیلی" اور "بادشاہ"، واحد بخش بزدار کی کتاب "رجا نگیں گالبند"، غوث بہار کی کتاب "آجوئی و چراگ" 2003 میں بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، شاہ محمد مری کی کتاب "تاریخ و تاظرہ کرد" 2004 میں سنگت اکیڈمی آف

سائنسز، کوئٹہ، غوث بخش صابر کی کتاب "مرزن ءِ شم" اقبال اکادمی پاکستان، اے آر داد کی
کتاب "شاعری و سفر" 2007میں درو چیل کیشنز، گوادر، یار جان بادینی کی کتاب "روح نامہ"
2007میں بلوچی لبزانکی دیوان، کوئٹہ، عبدالخالق خالد کی کتاب "پلانی نوکری" 2007میں ادبی
اکیڈمی بلوچی ویلفیئر، کراچی، منیر احمد بادینی کی کتاب "بنی آدم ءِ بخت" 2008میں بلوچی اکیڈمی،
کوئٹہ، اے آر داد کی کتاب "شعر ءِ لازم" 2009میں بلوچستان اکیڈمی، تربت، فضل خالق کی
کتاب "جوبان" 2010میں بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، ڈاکٹر عبدالصبور کی کتاب "کس مہ کندیت"
2010میں شعبہ بلوچی، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ، نامعلوم تکھاری کا "بیڈ پیلو" 2010میں
فریڈرک نومن فاؤنڈیشن، اسلام آباد کی جانب سے شائع ہوئی۔

اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ڈاکٹر عبدالصبور کی کتاب "آرواہ ءِ
موتک" 2011میں عہرور چیل کیشنز، کوئٹہ، طارق بوت کی کتاب "منی پچ من تئی ماہیں"
2011میں رئیسی چھاپ و شنگ، کراچی، زاہد آسکانی کی کتاب "مینا مار فور سنز" 2011میں
گلشان چیل کیشنز، گوادر، ڈاکٹر عبدالصبور کی کتاب "آتر" 2012میں بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، ڈاکٹر
عبدالصبور کی کتاب "رسینتگیں سر" 2012میں شعبہ بلوچی، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ، فضل
خالق کی کتاب "ناخدا بوجن" اور شرف شاد کی کتاب "در آمد" 2012میں بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ،
بیزن صبا کی کتاب "در آمد" 2012میں بلوچی ادبی مجلس، ڈاکٹر فضل خالق کی کتاب "مات" 2
201میں شعبہ بلوچی، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ، انور نور کی کتاب "اپنے سے لوگ ءِ پانگ
انت" 2012میں بلوچی ادبی مجلس، احمد علی ظفر کی کتاب "کرامات" 2012میں نقش چیل
کیشنز، کراچی، شاہ محمد مری کی کتاب "کمیونسٹ مینیفیسٹو" 2013میں عہرور چیل کیشنز، کوئٹہ،
جمیل حسین بلوچ کی کتابیں "سرکار ءِ حد ءُ دلیل"، "جو تنتن گلیلی ءِ ترو گرد"، "سرمایہ داری
راجبند ءِ اخلاقیات"، "آجوئی ءِ در گیجگ" اور "الغزالی" 2013 میں فریڈرک لونس فاؤنڈیشن،
اسلام آباد، علی گوہر کی کتاب "بالیں گلت" 2013میں سچکان چیل کیشنز، گوادر، شاہ محمد مری کی
کتاب "جہان جکسیں ددروش" 2013میں عہرور چیل کیشنز، کوئٹہ، اصغر علی آزگ کی کتاب "سا
پہاری" 2013میں بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، عزیز راسکوہی کی کتاب "مشبد ءِ جنگ
نامہ" 2014میں گل خان نصیر چیئر، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ، اے آر داد کی کتاب "دو سنگگیں

استار" 2014 میں ساچ پبلی کیشنز، گوادر، بیزن صبا کی کتاب "سدارتھ"، چاکر چاکرزئی کی
کتاب "پدریں لرش" اور حفیظ حسن آبادی کی کتاب "حاجی مراد" 2014 میں بلوچی اکیڈمی
، کوئٹہ، غیر محمد ندوی کی کتاب "فضائل اعمال" 2015 میں عدوی پبلی کیشنز لیاری، کراچی، برکھا
بلوچ کی کتاب "پیر مرزو ساوڑ" 2015 میں اسٹین شنگکار، تمپ، رحیم مہر کی کتاب "آئن اسٹائن"
2015 میں بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، شان گل کی کتاب "آزاتی" 2015 میں سنگت اکیڈمی آف
سائنسز، کوئٹہ، علی گوہر کی کتاب "ایسوپ ءِ گیدی کسہ" 2015 میں سیکان لبزانکی مجلس، گوادر،
ارشاد عالم کی کتاب "زہیران ءِ بیل" 2015 میں سید لبزانکی مجلس، گوادر، فدا احمد کی کتاب "کربلا
کس کا گمر ء ہشت ءِ کنت" 2015 میں سنگت اکیڈمی آف سائنسز، کوئٹہ، حمزہ بلوچ کی کتاب "
دانش ءُ شہوہاں"، علی گوہر کی کتاب "مرگ ءِ کسہ"، اشرف شاد کی کتاب "بلدیگ ءُ پوشاک" اور
پیش کپتگیں مرگ ءُ دیدبیتر" 2015 جبکہ عمر عثمان کی کتاب "ام ظل" اور باہوٹ حمید کی
کتاب "اہرام مصر" 2016 میں بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، اے آر داد کی کتاب "جوہان"
2016 میں اسٹین شنگکار، تمپ، اشرف شاد کی کتاب "زوال" 2016 میں سیکان پبلی کیشنز،
کراچی، ڈاکٹر بیزن بلوچ کی کتاب "ایوان ایلیچ ءِ مرگ"، اشرف شاد کی کتاب "وارڈ نمبر ششش" اور
ڈاکٹر علی دوست کی کتاب "اینیمل فارم" 2016 میں، فدا احمد کی کتاب "اوڈیس" اور مسرور
شاد کی کتاب "مردانی ءِ بام" 2017 میں اور عبداللہ شوہاز کی کتاب "مرگ ءِ دوشی" 2018 میں
سنگت اکیڈمی آف سائنسز، کوئٹہ، رحیم مہر کی کتاب "روسی آزمانک" 2018 میں عزت اکیڈمی،
پنجگور، غلام فاروق بلوچ کی کتاب "جہان اندریں مخلوق" 2018 میں بلوچی لبزانکی دیوان، کوئٹہ،
حفیظ رؤف کی کتاب "زردیں بور" 2018 میں اسٹین شنگکار، تمپ، عبدالحلیم امیر کی
کتاب "سیاہیں ماہیگ" 2018 میں علم و ادب پبلی کیشنز، کراچی، بلوچی اکیڈمی کی جانب سے
2019 میں سنگت رفیق کی کتاب "دانش سید"، عبداللہ دشتی کی The Jungle Book کا
ترجمہ "جنگل بک"، صادق ہدایت کے منتخب افسانوں پر مبنی نعیم بیزجان کی کتاب
"وجیگ" 2020 میں Stealing the hills کے ترجمے پر مبنی جمال بلوچ کی کتاب "کس
گبرے پہ گاری ءَ نگیں ایت"، The roots کے ترجمے پر مبنی اشرف افضل کی
کتاب "ریدگیں سانگل"، 1984 کے ترجمے پر مبنی ڈاکٹر بیزن صبا کی کتاب "نوزدہ صد ءُ ہشتاد ءُ

چار "The Pearl" کے ترجمے پر مبنی کتاب "مرواردو" اور 2021 میں منتخب اردو افسانوں پر مبنی غلام گوری کی کتاب "گلگشاں"، سسٹگیں دستونک کا ترجمہ "دی بروکن ورسز"، سوشاکو اینڈو کے ناول Silence کے ترجمے پر مبنی عمر عثمان کی کتاب "چیہاں موڑ"، گوبند مالحی کے ناول کے ترجمے پر مبنی عبداللہ شوہاز کی کتاب "رامم" اور رسول حمزہ توف کے ناول کے ترجمے پر مبنی فدا احمد کی کتاب "منی داغستان"، شرف شاد کی کتاب "مارکیز و آزمانک" 2019 میں ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی کی کتاب "ہشت ءُ گمان" 2021 میں انسٹیٹیوٹ آف بلوچیا کی جانب سے شائع ہوئی۔

حوالہ جات:

1۔ ڈاکٹر نعمت گچکی۔ 2012۔ رنگ۔ بلوچی لبزانکی پبلی کیشنز، کوئٹہ۔ ص۔ 241

2۔ مجاہد بلوچ۔ 2021۔ کتاب گِنگ۔ شعبہ بلوچی، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ

3۔ عرفان احمد بیگ۔ 2021۔ کتاب شون۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

4۔ صبا دشتیاری۔ 2003۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 1۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

5۔ صبا دشتیاری۔ 2007۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 2۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

6۔ صبا دشتیاری۔ 2009۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 3۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

سفر نامہ

بلوچی ادب میں سفر نامے کا آغاز بیسویں صدی کی پانچویں کی دہائی میں ہوتا ہے۔ان سفر ناموں میں اپنے وطن یعنی اندرون ملک کے ساتھ ساتھ بیرون ممالک انجانے دیسوں کی سیر، نئی فضاؤں سے آشنائی اور انوکھے مناظر کی دید کا تصور وابستہ دکھائی دیتا ہے۔ بلوچی ادب کے فروغ کے ساتھ ادیب اور دانشوروں نے جب اندرون یا بیرون ملک سفر کیا تو انہوں نے اپنے سفر نامے لکھنے شروع کئے۔ یوں بلوچی ادب میں سفر نامے کا آغاز ہوا۔ ابتدائی ایام یعنی چھٹی دہائی میں محمد صدیق آزات، ایوب بلوچ، عبداللہ جان جمالدینی اور قاضی عبدالرحیم صابر کے نام آتے ہیں۔ اس کے بعد حاجی عبدالقیوم، عبدالحکیم بلوچ، عاقل خان مینگل، قیوم سربازی اور ابراہیم جلیس گوری سفر نامے کے سفر میں ساتویں کی دہائی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ پھر آٹھویں کی دہائی میں عنایت حسین قومی، مولوی خیر محمد ندوی، ڈاکٹر علی دوست بلوچ، حبیب اللہ امیر، عبدالواحد بندیگ، ناکو تیاب دپی، مولانا عبدالواحد مورانی، عبدالسلام، کریم بخش وغیرہ اس کا حصہ بنتے ہیں۔ پھر نویں کی دہائی میں شے رگام، منیر احمد بادینی، ڈاکٹر بدل خان بلوچ، عابد آسکانی، حفیظ حسن آبادی، طاہر بزنجو اور ستار صیاد اس میدان میں اترتے ہیں۔ پھر اسی سفر میں بیگ محمد بیگل، سعید احمد بلوچ، یار جان بادینی، عزیز بلوچ پروی، شے کریم، ہوتی خان وغیرہ شامل ہو جاتے ہیں۔

سفر نامے میں ایوب بلوچ، ابراہیم جلیس گوری، منیر احمد بادینی اور عبدالصمد امیری کے نام نمایاں نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مختلف سفر نامے تحریر کر کے بلوچی ادب میں اس صنف کو نمایاں طریقے سے آگے بڑھایا ہے۔ بلوچی ادب میں شامل ان سفر ناموں میں مقامی سیاسی، سماجی حالات، ماحول کی نقش نگاری، بیرون ملک کے حالات معاشرتی اور تہذیبی عکس کشی، خوشی، دکھ، غم وغیرہ کو اپنے الفاظ میں سمو کر لوگوں کو نہ صرف معلومات فراہم کیں بلکہ شعوری

آگاہی کا ذریعہ بھی بنایا۔ یوں بلوچ قاری نے صرف اپنے وطن کے مختلف علاقوں بلکہ مختلف ملکوں کی سیر بھی گھر بیٹھے کر لی۔ واجہ صبا دشتیاری نے بلوچی زبان و ادب کے تحقیقی مقالے "بلوچی زبان و لبزانک میں "محترم عبداللہ جان جمالدینی کے سفر نامہ قلات کو بلوچی زبان کا پہلا سفر نامہ لکھا ہے جو جولائی 1957 کو ماہنامہ بلوچی میں شائع ہوا۔ تاہم محترم عبدالصمد امیری صاحب لکھتے ہیں انہوں نے پہلا سفر نامہ 1954 میں لکھا اور جو ماہنامہ بلوچی میں 1965 میں شائع ہوا۔ جس کا نام کوئٹہ بلوچستان، سفر نامہ ہے جو کہ قلمی نام مسافر کے نام سے شائع ہوا بعد میں عبدالصمد امیری نے بلوچی زند کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا کہ وہ ان کا سفر نامہ تھا۔ اس وقت تک منیر احمد کی کتاب "آنکھیں چمانی واب" 1996 میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ سے شائع ہو چکی تھی۔ 2010 میں ناکو احصا کی کتاب "ماکہ وہدے سر گپتگیں" کلام پبلیکیشنز گوادر نے چھاپی۔ اس طرح "بوستان و آزمانک" منیر احمد بادینی کا سفر نامہ ہے جو 2013 میں نیو کالج پبلیکیشنز کوئٹہ نے شائع کیا۔ اسی طرح بلوچی ادب کے نوجوان لکھاری مجاہد بلوچ نے مختلف رسالوں، مجلوں وغیرہ میں شائع شدہ سفر ناموں کو یکجا کیا ہے جو کہ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے دو جلدوں "دردانی سفر گران انت" کے نام سے شائع ہوئے، ان میں ایک جلد غیر ملکی اور دوسرا ملکی سفر ناموں پر مبنی ہے۔ حال ہی میں مریم سلیمان کی کتاب "بیا! تو کیں راہے شوہاز کنیں" بلوچی اکیڈمی کی جانب سے شائع ہوئی۔ اس خاتون سفر نگار نے اپنے امریکہ کے سفر کو فکشن کے انداز میں لکھ کر بلوچی ادب میں سفر نگاری کو جدیدیت سے روشناس کیا۔ 2017 میں مجاہد بلوچ کے ترتیب دیئے گئے سفر ناموں کا ایک اور مجموعہ کتابی شکل میں "جہانی سیم سر"، عزت اکیڈمی پنجگور، مجاہد بلوچ کی تحقیقی کتاب "سپر نامگ، بلوچی سپر نامگ" 2022 میں گدان اکیڈمی آف سائنسز اینڈ ریسرچ پنجگور کی جانب سے شائع ہوئے۔

حوالہ جات:

1۔۔ مجاہد بلوچ۔ 2021۔ کتاب گنج۔ شعبہ بلوچی، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ

2۔ عرفان جمالدینی۔ 2021۔ کتاب شون۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

3۔ صبا دشتیاری۔ 2003۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 1۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

4۔ صبا دشتیاری۔ 2007۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 2۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

5۔ صبا دشتیاری۔ 2009۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 3۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

طنز و مزاح

طنز و مزاح بھی ادب کا حصہ ہے۔ طنز و مزاح کے لئے بلوچی میں "ترّان ءُ ٹوک" کا لفظ استعمال ہوا۔ بلوچی ادب کے ارتقاء پر جب نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں طنز و مزاح کسی نہ کسی شکل میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ کلاسیکل دور میں چاکر و گہرام کے درمیان میں ہجو کے ذریعے نوک جھوک میں بھی دکھائی دیتا ہے تو مہناز کی علیحدگی کے بعد دوسری شادی کرنے کے بعد شہداد کو اپنے آسودہ زندگی گذارنے کے احوال میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ پھر ہر شاعر کسی نہ کسی طرح اپنی شاعری میں طنز کے عنصر کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔

بلوچی نثر نگاری میں طنز و مزاح کی صنف افسانہ کا ہمسر رہی ہے اور اس کے ساتھ ظہور پذیر ہوئی۔ بلوچی نثر میں طنز و مزاح کو ابتدائی طور پر صدیق آزات نے متعارف کرایا۔ جب پندرہ روزہ "زمانہ" کراچی کا انتظام ان کے ہاتھ تھا تو انہوں نے نومبر 1968 میں اپنے مزاحیہ کالم "جور یں دیر" کا آغاز کیا۔ یوں یہ کالم نومبر 1968 سے اکتوبر 1971 تک مسلسل چھپتا رہا۔ اس کے بعد اس میدان میں ہاتل و شتیاری کو متعارف کراتے ہیں اور وہ "بلوکپوت" کے عنوان سے مزاحیہ کالم لکھنے کی آغاز کرتی ہیں(1)۔

انسان کو بالعموم اور بلوچ کو بالخصوص مزاح اور مزاح نگاری کی اشد ضرورت رہی ہے۔ اپنی پوری تاریخ میں یہ قوم جنگ، جدل، وبا، مرگ، بیماری، مفلسی میں مبتلا رہی ہے۔ جہاں اس کے دل کی سختی، تنگی اور پریشانی کی شکنوں کی جلاوطنی کے لیے اس کی سیاسی، معاشی زندگی کو بدل کر رکھنا ضروری ہے تو اسی طرح اس کی زندگی میں تفریح پیدا کرنا نہایت اہم ہے۔ ادب اس سلسلے میں آکسیجن ہے مگر اس طرف بہت کم توجہ دی گئی(2)۔

بلوچی قدیم شاعری جائزہ لیا جائے تو ہمیں ملا فاضل رند، ملا قاسم رند، نور اللہ خاراقی اور

جوانسال بگٹی کی شاعری میں بھی طنز و مزاح کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ اسی طرح کوہ سلیمان کے مری بگٹی و بزدار علاقوں میں بلوچوں کی مشہور و معروف شاعری جو "نڑ و سر" کی موسیقی کے ذریعے گائی جاتی ہے جس کو "دستانغ" (داستان) کہا جاتا ہے۔ اس میں بھی طنز و مزاح عنصر موجود دکھائی دیتا ہے۔ واضح رہے کہ بلوچوں میں مقصد طنز و مزاح زخموں پر نمک پاشی نہیں بلکہ ہمواری کی نشاندہی سے زخموں کا علاج نظر آتا ہے۔

نثر نگاری میں طنز و مزاح کے شعبے میں بلوچوں کے نامور ادیب، دانشور اور محقق، محمد بیگ بیگل نمایاں نظر آتے ہیں۔ وہ نہ صرف رسائل میں مسلسل لکھتے رہے ہیں بلکہ ان کی کتابیں "جو کر، برزخ، زندیں دپار اور شگل و ماہین" طنز و مزاح پر مبنی ہیں۔ اس کے علاوہ صدیق آزات، بابل دشتیاری اور اکرم صاحب خان ناکو گوادری کا نام آتا ہے۔ پھر اس سفر میں طارق پیشکانی، ادیبی حکیم، عابد آسکانی، عیسیٰ گل، دلواش دانا، ناصر کوشکلاتی، لالو پیشکانی، پالان عمر، احمد جان مزار ظفر کریم وغیرہ بھی شامل ہو جاتے ہیں (3)۔

اگر کتابی صورت میں دیکھتے ہیں تو تو میر احمد دہانی کی کتاب "کاریں کاروان" طنز و مزاح کی پہلی کتاب شمار ہوتی ہے جو 1973 میں شائع ہوئی اور دوسری کتاب ناکو تیاب دپی یعنی اکرم صاحب خان کی "گواتی ہبات" جو 1986 میں شائع ہوئی۔ پھر اس میدان میں بہت سارے نام دکھائی دیتے ہیں۔ میر عیسیٰ قومی ان ابتدائی افراد میں شامل ہیں۔ جن کی شاعری کا حصہ "شکار"، سگیل دسوھو"، "حر واسپ تاچی"، "گروش"، "گوک دبلس و میزبنگ" جیسے مزاحیہ اشعار ہیں۔ خصوصاً ان کا یہ شعر "مائی ڈیئر کم توری" اس وقت مشہور ہوا کرتا تھا۔ اسی طرح آگے چل مزاح کے بادشاہ محمد بیگ بیگل، اکرم صاحب خان، عابد آسکانی، عیسیٰ گل، انور صاحب خان، ابراہیم عابد، ظفر کریم، بھلان عمر، لالو پیشکانی اور خاران سے قیوم سادگ و دیگر نام نظر آتے ہیں۔

اس صنف میں کتابوں کی باقاعدہ اشاعت 1973 میں شروع ہوتی ہے۔ اسی سال میر احمد دہانی کی کتاب "کاریں کاروان" 1973، اکرم صاحب خان کی کتاب "گواتی ہبات" اور محمد بیگ بیگل کی کتاب "شگل و ماہین" مکتبہ سوغات، کراچی اور سید لبزانکی مجلس کی جانب سے شائع ہوتی ہے۔ اس کے بعد محمد بیگ بیگل کی کتاب "زندیں دپار" 1995 میں سید لبزانکی مجلس، اکرم صاحب خان کی کتاب "تل ءِ آزاد" 1999 میں بلوچی دود ءُ ربید گچین ءِ دیوانی انجمن، کراچی، عابد

آسکانی کی کتاب "چو شیں شوم ءِ شازدہ" 2000 میں، بہار گاہ چھاپ ءُ شنگ، حب، محمد بیگ بیگل کی کتاب "بور ر" 2006 میں بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، عابد آسکانی کی کتاب "چو شیں نیک ءُ نیکیت" 2010 میں، بہار گاہ چھاپ ءُ شنگ، حب، عیسیٰ گل کی کتاب "بارسگ" 2010 میں آرچ پ کمیونیکیشن، پیدکان، اکرم صاحب خان کی کتاب "پد گوانک" 2012 میں زبان ہیرین، محمد بیگ بیگل کی کتاب "برزخ" 2012 میں بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، ادبی تچکیم کی کتاب "وشکند" 2015 میں رئیسی چھاپ ءُ شنگ جاہ، کراچی، طارق پیدکانی کی کتاب "تلک" 2016 میں بلوچ سوشل میڈیا گروپ، پنجان عمر کی کتاب "رژنگ" 2016 میں آجو ہیل پبلشرز، کراچی، طارق پیدکانی کی کتاب "باہو کمر کلریت" 2017 میں دیمروئی مجلس، یونس واہگ کی مرتب کردہ کتاب "شلیں جور" 2017 میں اشتین شنگکار، کیچ، دلوش دانا کی کتاب "ورد گ ءِ بنداں" 2018 میں ہاج، ہیرین، عیسیٰ گل کی کتاب "نگاگ ءِ زیراں" 2018 میں دیمروئی مجلس، عابد آسکانی کی کتاب " 2018 میں بہار گاہ چھاپ ءُ شنگ، حب، ناصر کوشکلاتی کی کتاب "شنک ءِ برشکندگ" پاک نیوز ایجنسی، تربت کی جانب سے شائع ہوئی ہیں۔

حوالہ جات:

1۔ اصغر محرم غیرت۔ 2012۔ گچین ءُ تاک، آزینک۔ بلوچستان اکیڈمی، تربت۔
ص۔ 102

2۔ شاہ محمد مری۔ 2012۔ =================۔ ص۔ 12

3۔ یونس واہگ۔ 2012۔ گچین تاک، آزینک۔ بلوچستان اکیڈمی، تربت۔
ص۔ 101-102

4۔ مجاہد بلوچ۔ 2021۔ کتاب گنج۔ شعبہ بلوچی، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ

5۔ عرفان جماعدینی۔ 2021۔ کتاب شون۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

6۔ صبا دشتیاری۔ 2003۔ بلوچی زبان ءُ لبزانک۔ 1۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

7۔ صبا دشتیاری۔ 2007۔ بلوچی زبان ءُ لبزانک۔ 2۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

8۔ صبا دشتیاری۔ 2009۔ بلوچی زبان ءُ لبزانک۔ 3۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

حالتران

انٹرویو (Interview) معلومات کے حصول کا طریقہ ہے جس میں سوالات پوچھے جاتے ہیں اور جواب دیے جاتے ہیں۔ سیاسی، سماجی، ثقافتی، علمی اور ادبی شعبہ جات سے وابستہ افراد سے باضابطہ ملاقات کر کے دوران ملاقات ان کی زندگی، خدمات، کارنامہ ہائے، حالات اور ان کے خیالات و نظریات کے بارے میں سوالات کے جوابات حاصل کر کے انھیں اخبارات، رسائل و جرائد کی زینت بنا کر انھیں لوگوں تک پہنچانے کے عمل سے آگہی حاصل ہوتی ہے۔ اسی باضابطہ ملاقات کو انگریزی میں "انٹرویو" کہا جاتا ہے۔ جبکہ اسے بلوچی زبان میں "حالتران" کہتے ہیں۔

انٹرویو کو بلوچی میں "حالتران" کہا جاتا ہے۔ بلوچی ادب میں اس صنف کی ابتدا بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں ہوتی ہے۔ دستیاب شواہد کے مطابق ماہنامہ اولس جنوری 1968 کے شمارے میں نامور محقق، دانشور اور ادیب عبدالغفار ندیم نے مکران کی ادبی شخصیت عنایت اللہ قومی کا انٹرویو شائع کیا۔ اسی طرح عطا شاد نے اولس نومبر او دسمبر 1968 کے شمارے میں مشرقی بلوچستان کے نامور شاعر جوانسال بگٹی کا انٹرویو شائع ہوا۔ اس کے اگلے سال عبدالرحیم ظفر نے زمانہ جنوری 1969 کے شمارے میں ولی محمد اور اکبر بارکزئی زمانہ 15 اپریل 1969 میں عبدالصمد امیری کا انٹرویو شائع کیا یوں پھر ایک نہ ٹوٹنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اولس، زمانہ بلوچی، سوب، ساچان، لبزانک، بلدرو، منزل، چیتان، کاروان، روژن، گوانک، چاگرد، بلوچی لبزانک، میار، بہارگاہ، سگار، باہوٹ، مستاگ، زندمان، آساپ، شبنداں، شوہاز، نوکین دور، سوغات، شپینگ، جام، نوائے وطن، پجار گ، گیشلور، لب بولان، سنگت، زند، بلوچی زند وغیرہ نام رسائل اور جرائد میں مختلف ادبی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی شعبوں میں خدمات سر انجام دینے والی

شخصیات کے انٹرویو شائع ہوتے رہتے ہیں۔

بلوچی ادب میں انٹرویو کی ابتدا تو عبدالغفار ندیم نے کی پھر عطا شاد، عبدالرحیم ظفر، اکبر بارکزئی، آزاد جمالدینی، ابراہیم جلیس نگوری، مولوی خیر محمد ندوی، عیسیٰ بلوچ، ہشام بلوچ، محمد صدیق آزات، محمد کریم آزاد، عبداللہ جمالدینی، عابد آسکانی، صبا دشتیاری، خالد احمد، آفتاب بلوچ، اکرم بلوچ، ایم اے بلوچ، بلراج بلوچ، ڈاکٹر علی دوست، حاجی عبدالقیوم، عبدالواحد حنیفا بلوچ، ڈاکٹر وحید بلوچ، عبدالصبور بلوچ، نصراللہ بلوچ، غلام فاروق بلوچ، مبارک قاضی، کریم بلوچ، مبارک علی بلوچ، مراد ساحر بلوچ، منظیر بلوچ، نسرین بلوچ، م بلوچ، عبدالواحد بندیگ، کریم باشندہ، بیگ محمد بیگل، غلام محی الدین سیار، آمنہ نور نہیں، حنیفا حسن آبادی، عارف حقانی، منیر مومن، یوسف عزیز مگسی، عبدالحق نقش، ممتاز یوسف، غفور محی ظفر، اصغر علی آزگ، نصیر داد اللہ، حسرت تیر آبادی، نصیر احمد نصیر، اے۔آر داد، اعجاز ذاکر، انور انجار، واحد بخش رادی، حمل رضا، صمیم جان رضا، زبان دوست، غوث بخش سراج، یار محمد یار، قیوم سرپڑی، عبدالوحد شاکر، غنی پرواز، رحیم بخش آزاد، علیم شمیم، غوث بخش صابر، اکرم صاحب خان، بیژن صبا، آمنہ پنوہ، ظفر اکبر شاد، اسلم قادر، ابراہیم عابد، بختیار عبدالجلیل، نصیر احمد عالم، عبدالرشید عومرزئی، عطاء اللہ قطانی، اللہ بخش کردو، طاہر پیشکانی، کامریڈ عبدالواحد، منیر بن کریم، عید محمد عید، زبیر کلانچی، رضوان کیسر، بہرام مگسی، گلزار خان گچکی، یعقوب عامل کرمکانی، مہناز لرستانی، صادق مراد، تاج محمد طائر، امیر عمر میر، فضل کریم، نور محمد نور، اسلم آزاد، زرین آسکانی، امان جان امان، امیر بخش امیر، عبدالحمید ایران شہر، یار جان بلوچی، نسیم بشیر، محسن بلانچ، آر۔ڈی بلوچ، تاج محمد بلوچ، شکیل احمد بلوچ، عبداللہ بلوچ، غلام فرید بلوچ، فضل الرحمٰن بلوچ، حفیظ دشتی، عبدالرحمٰن دشتی، رفیق راہ، علی زامرانی، عید و شکر، امام بخش عابد، بدر عابد، ایاز عارف، عبدالقدوس قاضی زادہ، شریف قاضی، ولیل بلوچ مگسی، امداد گلستی، صادق مراد، ایم اے ممتاز، میر حمل نصیر، یونس نصیر، غلام علی، عبدالغنی بوت، محمد فاروق بوت، واحد ہاشم وغیرہ نے جواں سال گچکی، عنایت اللہ قومی، عبدالصمد امیری، ولی محمد، غوث بہار، رحیم بلوچ، غلام محمد بلوچ اور اپنے وقت کے موجود لاتعداد living legends کے انٹرویو کر کے شائع کرائے۔

زندآوینک

سوانح یا سوانح عمری کو انگریزی زبان میں (Biography) کہتے ہیں۔ بلوچی زبان میں اسے "زندآوینک" کہتے ہیں۔ سوانح عمری ایک شخص کے ذریعہ کی گئی داستان ہے جو اس کی زندگی کے دوران ہوا یا اس کے ایک ٹکڑے کے بارے میں۔ اگر یہ عام (پوری زندگی) ہے تو، اس میں بچپن، خاندانی تاریخ، فتوحات، ناکامیوں، محبتوں، دلوں کی دھڑکنیں، سفر اور اس کے وجود کے گرد گھومنے والی ہر چیز سے متعلق پہلو شامل ہیں۔ سوانح عمری کو خود ایک ادبی صنف سمجھا جاتا ہے۔ یہ تاریخ اور ادب کی حدود کے مابین منقسم ہے، چونکہ اس قلم میں مرکزی کردار۔ جو خود اس مضمون کا مصنف ہے۔ جو مختلف معاشرتی، سیاسی اور ثقافتی واقعات کی داستان کے دوران قرار نہیں ہو سکتا ہے جن کی زندگی اس کی زندگی کا نشان تھی۔ بلوچی زبان میں سوانح عمری "زندآوینک" کا آغاز بیسویں صدی کے پانچویں دہائی میں ہوتا ہے۔ جب بلوچی زبان میں رسائل کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ ویسے تو بلوچی زبان کا پہلا ماہنامہ اومان کہلاتا ہے۔ جو فروری 1951 کراچی سے شائع ہوا لیکن حقیقت میں اس سے قبل ماہنامہ "معلم" کا نشان ملتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ "اومان" سے قبل ہمیں ایک رسالے کا ذکر ملتا ہے جو کہ شالکوٹ یعنی کوئٹہ سے نومبر 1950 سے شائع ہوا۔ اس ماہنامے کا نام "معلم" ہے۔ جس کے ایڈیٹر عبدالباقی درخانی تھے جبکہ ایڈیٹر ملک محمد رمضان اور معاون ایڈیٹر عبدالرحمٰن غور رہے۔ یہ ماہنامہ پانچ زبانوں میں تھا جس میں بلوچی، براہوئی، پشتو، فارسی اور اردو شامل ہیں۔ اگر کوئی تنقید کرے کہ یہ رسالہ صرف ایک زبان یعنی بلوچی میں شائع نہیں ہوتا تھا اس لئے اس کو پہلا رسالہ نہیں کہہ سکتے تو ٹھیک ہے اگر اسی طرح ہم ماہنامہ اومان پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ بھی صرف بلوچی زبان میں شائع نہیں ہوتا تھا۔ یہ بلوچی اور اردو میں شائع ہوتا تھا۔ دو زبانوں کا رسالہ تھا۔ وہ

ماہنامہ جو صرف بلوچی زبان میں شائع ہوا تو وہ مرحوم آزاد جمالدینی کا "بلوچی" تھا جو جون 1956 میں کراچی سے شائع ہوا(1)۔

بلوچی زبان میں مختلف ملکی اور بین الاقوامی سیاسی، سماجی، ثقافتی اور ادبی شخصیات کے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر لکھے جانے کا آغاز ہیں۔ ماہنامہ اومان کے مئی 1952 کے شمارے میں میر یوسف عزیز مگسی کے زندگی کے بارے میں عبدالخالق آفاقی، قاضی عبدالرحیم صابر، مولائی شیدائی اور مولوی خیر محمد ندوی کے تحاریر کا ذکر ملتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اومان مئی 1952 کا شمارہ بلوچستان کے جدید سیاست کے محرک میر یوسف عزیز مگی کے متعلق خصوصی شمارے کی حیثیت سے شائع کیا گیا اس شمارے میں اُن اس کے بارے میں چار نامور شخصیات نے اپنے خیالات تحریر کئے اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا۔ اس سے قبل ماہنامہ اومان کے ادارے کے جانب سے جنوری 1952 کے شمارے میں میر چاکر خان رند، میر عبداللہ خان قہار، میر نصیر خان اعظم کے بارے میں تحاریر کا ذکر ملتا ہے۔

بلوچی زبان کے جن رسالوں اور جرائد میں سوانح کے بارے میں تحاریر کا ذکر ملتا ہے ان میں اومان، بلوچی، بہارگاہ، سوغات، بلوچی لبزانک، نوکیں دور، براتز، یاگی، گوانک، ترانہ، صدائے بلوچ، بند یگ، منزل، چمگان، شم، برمش، نوائے وطن، درخشان، گروک، یاتاتی تاریخ، چاگرد، سنگار، باتیل، لبزانک، کیچ، لبزانک، بلدرد، سنج، باسار، زندمان، سچکان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جن نامور لکھاریوں نے اس صنف میں ابتدائی طور پر قلم سخن وری کی ان میں عبدالخالق آفاقی، مولائی شیدائی، قاضی عبدالرحیم صابر، شیر محمد مری، محمد حسین عنقا، مولوی خیر محمد ندوی، لالہ غلام محمد شاہوانی، بابو عبدالکریم شورش، گل خان نصیر، آزات جمالدینی، عبداللہ جان جمالدینی، عصمت اللہ جمالدینی، پیر محمد پیرل زبیرانی، امیر شاہ عمیری وشتی، عبدالرحمن پہوال، عبدالرحیم ظفر، ظفر علی ظفر، بیگ محمد بیگل، عبدالرحمن نور، اسحاق شمیم، مولوی محمد حسین عاجز، امان اللہ گچکی، محمد ابراہیم جلیس گوری، میر نصیر احمد خان احمد زئی، ملک محمد پناہ، عطا شاد، ملک محمد رمضان شامل ہیں۔ پھر یہ قافلہ بڑھتا گیا۔ اس میں شامل ہونے والے دیگر سخن وریوں ہیں: محمد سردار خان گشکوری، نسیم اللہت، یار محمد یار، یوسف عزیز گچکی، صباد شتیاری، حمل خان جوش گشکوری، اشیر عبدالقادر شاہوانی، میر احمد دہانی، چاکر خان رند، اشرف شربازی، ڈاکٹر فضل

خالق، مولانا عبدالخالق دُرخانی، مولانا عبدالغفور درخانی، میر عاقل مینگل، سیدہان مری، صورت خان مری، ڈاکٹر نعمت گچکی، مٹھا خان مری، محمد حیات مری، محمد خان مری، محمود خان مری، عبدالغنی تبسم گرانی، عبدالغنی گرانی، امان اللہ بلوچ، جی۔آر ملا، امام بخش بلوچ، عبدالقیوم بلوچ، بشیر احمد بلوچ، مرزا طاہر محمد خان، منیر احمد بادینی، محمد اسحاق ساجد بزدار، محمود خان مومن بزدار، اکبر بارکزئی، نیک محمد بزدار، واحد بخش بزدار، عزیز احمد بگٹی، ماسٹر مراد آوارانی، مولانا ضیاء الحق خلیلی، غنی پرواز، غوث بہار، ملک سعید احمد دہوار، محمد ایوب بلوچ، طاہر بزنجو، عطاء اللہ بزنجو، ہدایت اللہ پلی آبادی، یار خان بادینی، رخسانہ بلوچ، زینت ثنا، فریدہ بلوچ، م۔ سلطانہ، بشریٰ قیوم، عباس علی زیمی، علی رئیسی، پروین رند، عبدالمجید ایران نژاد، کریم بشندہ، محمد صدیق آزاد، محمد کریم آزاد، اصغر علی آزگ، بیژن صباء، ڈاکٹر کہور خان، شہداد چاہسری، ثنا بلوچ حسن آبادی، حفیظ حسن آبادی، اکرم صاحب خان، ستارہ صباء، ظہور راہی، عید شاد، ممتاز یوسف، عابد آسکانی، نصیر آزاد، ظفر اکبر، جمال عبدالناصر بلوچ، سجاد کوثر بلوچ، سمینہ ابراہیم بلوچ، عبدالصبور بلوچ، محمد شیردل بلوچ، نوتک بلوچ، گوہر حسن آبادی، اے آر داد، بائل مہردازئی، شرف شاد، بیبرل شے نگری، شکیل غریب، غلام فاروق، سلطان قیصرانی، عنایت اللہ قومی، س۔ کنول، زبیر خان گشکوری، ڈاکٹر شاہ محمد مری، رزاق نادر، حسین وڈیلہ، نوابان، کامریڈ عبدالواحد، ڈاکٹر بدل خان بلوچ، حمید بلوچ، گلزار خان گچکی، طاہر بیڈکانی، عبدالستار خاموش، اکبر قشاوزئی، عبدالرزاق لاسی، اختر ندیم، قاسم قیصرانی وغیرہ شامل ہیں۔

سردار خان بلوچ کی 1956 میں شائع ہونے والی کتب "پیشگ ء بلوچ" اور "دی گریٹ بلوچ" اور 1982 میں "پاکستان ء صوفی" (پاکستان کے صوفی) اسی سال آغا نصیر خان احمد زئی کتاب "نامداریں مروم" (نامور شخصیت)، سردار خان بلوچ کی کتاب "مشہوریں صوفی" (نامور صوفی) اور منیر احمد بلوچ "مئے نامی ایں مسلمان" (ہمارے نامور مسلمان) بلوچی اکیڈمی کی جانب سے شائع ہوئیں۔ اسی طرح اثیر عبدالقادر شاہوانی کا ترتیب دی ہوئی کتاب "ناطق مکرانی" بھی سوانح میں شمار کی جا سکتی ہے۔ "ورشہ" ڈاکٹر عبدالصبور بلوچ کی میر گل خان نصیر کے بارے میں اردو کی کتاب ہے اس کتاب میں میر گل خان نصیر کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا۔ جو کہ بلوچی اکیڈمی نے 2005 میں شائع کی۔ رحیم مہر کی کتاب "آتن

اسٹائن "سوراے آر دو کی کتاب "ٹی ایس ایلیٹ" باترتیب 2015 اور 2016 میں بلوچی اکیڈمی نے شائع کیں جو کہ مختلف نامور تاریخی اشخاص اور کرداروں کے سوانح اور زندگی کے مختلف پہلوؤں بارے میں دیگر محققین اور مورخین نے ترتیب دیئے۔

اسی طرح عبداللہ جان جمالدینی کی کتاب "زندگی نامک" 2015 میں شعبہ بلوچی، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ اور منیر احمد بادینی کی کتاب "زندگانی نامک" 2018 میں چنگ چھاپ؛ تنگ، ناصر آباد کیچ، غنی پرواز کی کتاب "یاتانی دریا چول جنت" 2021 میں بلوچستان اکیڈمی تربت اور نذیر دہقان کی کتاب "پہ گوزانت بارگ" 2021 میں انسٹیٹیوٹ آف بلوچیا کی جانب سے شائع ہوئیں۔

حوالہ جات:

1۔ صبا دشتیاری۔ 2009۔ بلوچی زبان و لیٹریچر 3۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ کراچی۔ ص۔ 22-21

2۔ مجاہد بلوچ۔ 2021۔ کتاب گچ۔ شعبہ بلوچی، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ

3۔ عرفان جمالدینی۔ 2021۔ کتاب شون۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

4۔ صبا دشتیاری۔ 2003۔ بلوچی زبان و لیٹریچر۔ 1۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

5۔ صبا دشتیاری۔ 2007۔ بلوچی زبان و لیٹریچر۔ 2۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

تبصرہ نگاری

تبصرہ کا لغوی معنی تصریح، تفصیل اور توضیح ہوتا ہے۔ یہ تینوں الفاظ ایک دوسرے سے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں۔ کسی بھی تخلیق پر تبصرہ لکھنا دراصل اس تخلیق میں موجود مواد کی توضیح و تصریح کے ضمن میں آتا ہے۔ تبصرہ جسے بلوچی زبان میں "چارشانک" اور انگریزی میں ریویو (Review) کہا جاتا ہے۔ جس میں کسی تخلیق کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لے کر اس پر اپنی رائے کا اظہار کیا جاتا ہے۔ جس میں مثبت اور منفی پہلوؤں اور خوبیوں اور خامیوں کو اچھی طرح اجاگر کیا جاتا۔ محققین کے مطابق یہ تقریظ کا تسلسل ہے کیونکہ زمانہ جاہلیت میں تقریظ کا رواج تھا۔ بازار عکاظ میں جب صدر مجلس مختلف شاعروں کا کلام سن کر کسی شاعر کو دوسروں کی نسبت تعریفی اور توصیفی کلمات سے نوازتا تو اسے تقریظ کہا جاتا ہے۔ یہ چونکہ محدود ہیئت پر مشتمل تھا جبکہ اب اگر کوئی نقاد، قاری یا محقق کوئی تحریر، کتاب یا تخلیق کو پڑھ کر اس کے بارے میں جائزہ لکھے تو اسے تبصرہ کہا جاتا ہے۔

بلوچی ادب میں چارشانک (تبصرہ) بھی ہمیں دیگر اصناف کی طرح بیسویں صدی میں میدان میں اترتی نظر آتی ہے جب اومان، زمانہ بلوچی، سوغات، نوکین دور، نوائے وطن، سنج، ہنگتان، اولس، صدائے بلوچ، بلوچی، بہارگاہ، جالار، میار، آساپ، تراپشل، مکام، چمگ، زہیر، سنج، چاگرد، رچ راگ، ودیگر رسائل اور جرائد کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔

دستیاب شواہد کے مطابق پہلے تبصرہ نگار نوری خان مری ہیں جنہوں اومان کے اپریل 1952 کے شمارے میں "پاک بلوچی قاعدہ" پر تبصرہ لکھا۔ نوری خان مری کا بلوچی ادب میں کہیں اور ذکر نہیں ملتا (ہو سکتا ہے کہ کسی نامور لکھاری نے دوسرے نام سے یہ تبصرہ لکھا ہو یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا)۔ اسی سال یعنی 1952 میں اومان کے جون کے شمارے میں عبدالصمد امیری کا تبصرہ بھی اسی قاعدے کے متعلق ہی چھپا ہے جسے ہم دوسرا تبصرہ کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد اسحاق شمیم کا تبصرہ "جوریں تران" اومان فروری 1957 کے شمارے میں چھپا ہے۔

مذکورہ بالا شواہد سے عیاں ہوتا ہے کہ عصری ادب کے دیگر اصناف کی طرح اس صنف کی بنیاد بھی بیسویں صدی کی چھٹی دہائی اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے۔ اس صنف میں عبداللہ جان جمالدینی، سید ظہور شاہ ہاشمی، عبدالرحمٰن غور، اسحاق ورزئی، آغا نصیر خان احمدزئی، محمد صدیق آزاد، برکت علی، عبدالحکیم بلوچ، عطا شاد، غوث بخش صابر، صورت خان مری، امیر علی شہ دمان، محمد طاہر خواجہ خیل، قاضی عبدالحمید شیرزاد، عبدالغفار ندیم، میر عاقل مینگل، مٹھا خان مری، رزاق نادر، اسماعیل ہیری، ایوب بلوچ، عبدالقیوم بلوچ، محمد بیگ بیگل، فقیر محمد عنبر منگوری، صوفی نیر محمد ندوی، گنجاتون گلستی، محمد کریم آزاد، عابد آسکانی، نور آسکانی، ماسٹر مراد آواری، عزت ابراہیم، قیوم سربازی، اکبر علی اکبر، حبیب اللہ امیر، عزیز محمد بگٹی، حمل بلوچ، شاہنواز بلوچ، زینت ثناء بلوچ، مبارک قاضی، منیر شاہ ہوتی، مراد بلوچ، غنی پرواز، غنی پہوال، حنیف حسن آبادی، ڈاکٹر فضل خالق، اے آر داد، یوسف رضا، جلب خان، لعل بخش دلاوری، شاہ دوست رند، ماسٹر حسن علی کشکی، بیرل شے ٹکری، بشیر شہزاد، عبدالواحد شاکر، امان اللہ صابر، احمد علی نشتر، عبدالسلام عارف، ڈاکٹر علی دوست بلوچ، نصیر احمد ہیم، عبدالرشید عومرادی، الٰہی بخش غائب، میجر مجید، ملنگ شاہ مسلم، سلمان مری، اسماعیل ممتاز، فضل کریم نادر، سکینہ ناز، ناگمان ہمدم، غلام گموری، ملا نقدی، عاقل بابا خوشداد، زرین آسکانی، زبیر آسکانی، یار جان بدیلی، اسحاق بلوچ لنگری، عبیداللہ بڑی، دوستین بلوچ، سجاد کوثر بلوچ، ارشاد پرواز، عزیز پیکانی، نازل رخشانی، فدا دشتی، شرف شاد، حنیف شریف، داد محمد صلاح کوہی، خلیل عارف، رحمت عارف، عابد علیم، اکبر فشاد، کے بی فراق، انور شہ قطانی، کریم دادو گزوری، یونس کلانچی، مومن معراج، مجیب مجاہد، غلام رسول گلستی، منیر نظار، رحمان مراد، میر عمر میر، محمد اکرم، یار محمد ساکم ودیگر طبع آزمائی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

حوالہ جات:

1۔ صبا دشتیاری۔ 2009۔ بلوچی زبان و لبزانک 3۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ کراچی۔ ص۔ 22-21

2۔ مجاہد بلوچ۔ 2021۔ کتاب گنج۔ شعبہ بلوچی، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ

3۔ عرفان جمالدینی۔ 2021۔ کتاب شون۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

4۔ صبا دشتیاری۔ 2003۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 1۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

5۔ صبا دشتیاری۔ 2007۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 2۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

لغت و اصطلاحات

اصطلاحات سازی اور لغت نویسی کا شمار بھی ادبی اصناف کا حصہ شمار ہوتی ہیں، جس میں زبان کے ذخیرہ الفاظ کے ساتھ ساتھ اس میں مروج اصطلاحات کو یکجا کر کے زبان کی ترقی و ترویج کی راہ ہموار کی جاتی ہے۔ لغت کو " لبزبلد ،لبزانت بلد ،ور لبز گنج" کہا جاتا ہے جبکہ اصطلاحات کے لئے "اسم لبند "کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ بلوچی زبان کے لغت نویسی کے شعبے میں کام کی ابتدا کو کا سہرا مستشرقین کے سر جاتا ہے۔ 1909 میں ایک انگریز المرئی۔ جے۔ میئر نے انگلش بلوچی ڈکشنری شائع کی جو کہ بعد میں 1975 میں لاہور سے شائع ہوئی۔ جب یہ ڈکشنری نایاب ہوئی تو اسے بلوچی اکیڈمی نے اسے دوبارہ شائع کیا۔

اسی طرح نامور محقق، ادیب، شاعر اور دانشور، سید ظہور شاہ ہاشمی کی مرتب کردہ بلوچی لغت "سید گنج" ایک خوبصورت کاوش ہے جو سید ہاشمی اکیڈمی کی جانب سے 2000 اور 2017 میں شائع ہو کر بھرپور پذیرائی حاصل کر چکی ہے۔ تو بلوچی اکیڈمی کی جانب سے 1970 میں شائع کردہ مٹھا خان مری اور صورت خان مری کی "بلوچی اردو لغت" بلوچی لغت نویسی میں بہترین اضافہ ہے۔ عطا شاد اور مٹھا خان مری کی جانب سے مرتب شدہ "اردو بلوچی لغت" 1972 میں اردو سائنس بورڈ کی جانب سے شائع ہوئی۔ غوث بخش صابر اور پیر محمد زبیرانی نے " بتال" کے نام سے ایک کتابچہ ترتیب دیا جو بلوچی اکیڈمی نے 1972 میں شائع کیا۔ اسی طرح عزیز مینگل نے بھی "نیم زبانی" لغت مرتب کی۔ غوث بخش صابر اور پیر محمد زبیرانی کی جانب سے مرتب شدہ کتاب "بلوچی ویکبلری " 1982 میں بلوچی اکیڈمی کی جانب سے شائع ہوئی۔ میر عاقل خان مینگل کی جانب سے ترتیب دی گئی "اے پرشین بلوچی ویکبلری" 1990 میں بلوچی اکیڈمی نے شائع کی۔ حاجی عبدالقیوم کی جانب سے مرتب شدہ "بلوچی بوسیا" بلوچی

انگریزی لغت ابتدائی کاوشوں میں شمار ہوتی ہے۔ جو 1959 میں بولان کارپوریشن کوئٹہ اور بعد میں 1997 اور 2004 میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے شائع ہوئی۔

میر احمد دہانی نے "میر گنج" کے نام سے بلوچی اُردو لغت ترتیب دی جو کہ بلوچ اتحاد ادبی اکیڈمی نے 2000 میں شائع کی۔ اسی طرح افغانستان کے نامور بلوچ ادیب عبدالرحمن پہوال نے بین الاقوامی ڈکشنری کے بلوچی حصے پر کام کیا ہے۔ ڈاکٹر واحد بخش بزدار نے بلوچی اصطلاحات پر مبنی کتاب "بلوچی گالبند" بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے 2004 میں شائع کی۔ نذیر دادو کی "بلوچی انگریزی ڈکشنری" دُرِ دبلی کیشنز گوادر کی جانب سے شائع ہوئی۔

الفت نسیم نے "بلچی لغت" ترتیب دی، جسے بلوچی اکیڈمی نے 2005 میں شائع کیا۔ جس میں جڑی بوٹیوں، جانوروں اور انسانوں اور مویشیوں کی بیماریوں وغیرہ جیسے الفاظ کا ذخیرہ ملتا ہے۔ اسی طرح اسحاق خاموش "بلوچی لبز بلد" آشار پبلیکیشنز کراچی سے 2015 اور 2017 میں شائع ہونے والی بلوچی، اُردو، انگریزی ڈکشنری بھی ایک خوبصورت کاوش ہے۔ سید ریفرنس لائبریری اور بلوچستان اکیڈمی تربت کی جانب سے 2008 اور 2011 میں ناگمان کا مرتب کردہ بلوچی زبان کے الفاظ کا ذخیرہ "توکاز" بھی بلوچی اُردو اور انگریزی لغت ہے۔ اے آر داد کی کتاب "لبزانکی گالبند" نامی کتابچہ بلوچستان اکیڈمی تربت کی جانب سے 2012 میں شائع ہوئی۔ اس کو بھی بلوچی ادب کا گرانقدر سرمایہ شمار کیا جاتا ہے۔ غلام رسول کلمتی کی کتاب "بلوچی گالریچ"، "بلوچی ردانگال" اور "بلوچی ونڈ" 2018 میں سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی کی جانب سے شائع ہو چکی ہیں۔

بلوچی اکیڈمی کی جانب سے 2015 اور 2017 میں جان محمد دشتی کی ادارت میں مرتب ہونے والی "لبزبلد" ایک جامع لغت اور خوبصورت کاوش ہے جس کو علمی اور ادبی میدان خوب سراہا گیا اور اشاعت کے دو ماہ کے اندر اس کی ڈھائی ہزار کاپیاں بک گئیں۔ بلوچی کے پہلے جامع لغت لبزبلد کے ترتیب دینے میں ڈکشنری کمیٹی نے بھرپور کردار ادا کیا، جس کے چیئرمین جان محمد دشتی تھے۔ ممبران منیر جان بلوچ اور واحد بخش بزدار تھے۔ ڈکشنری کی تیاری میں جان محمد دشتی ایڈیٹر انچیف جبکہ الفت نسیم، گلزار خان مری، غوث بہار، غنی پہوال، عبدالصبور بلوچ، محمد یوسف مینگل، ڈاکٹر مینی بلوچ، واحد بزدار، ساجد بزدار، مولوی عبدالحق بلوچ، یوسف گچکی اور

اشرف سربازی ایڈیٹر تھے۔ اسی "لبزبلد" میں اضافہ و ترمیم شدہ ایڈیشن بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے شائع ہوا۔

ڈاکٹر نصیر دشتی کے مرتب شدہ "بلوچی انگریزی لبزبلد" بلوچی انگریزی لغت 2019 میں بلوچی اکیڈمی کی جانب سے شائع ہوئی جبکہ انگریزی بلوچی ڈکشنری بلوچی اکیڈمی کی جانب سے 2022 میں شائع ہو چکی ہے۔ "براہوئی بلوچی زبان ءِ گنج" حمید عزیز آبادی کی بلوچی براہوئی ہم معانی لفظوں پر مشتمل کتاب 2020 میں بلوچی اکیڈمی کی جانب سے شائع ہوئی۔ اسی طرح راقم یحییٰ پناہ بلوچ کے جانب سے مرتب شدہ بلوچی، سندھی، براہوئی اور اردو لغت "لوز گنج" 2022 میں بلوچی اکیڈمی کی جانب سے شائع ہوئی۔

حوالہ جات:

1۔ صبا دشتیاری۔ 2009۔ بلوچی زبان ءُ لبزانک 3۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ کراچی۔ ص۔ 21-22

2۔ مجاہد بلوچ۔ 2021۔ کتاب گنج۔ شعبہ بلوچی، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ

3۔ عرفان جاملدینی۔ 2021۔ کتاب شون۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

4۔ صبا دشتیاری۔ 2003۔ بلوچی زبان ءُ لبزانک۔ 1۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

5۔ صبا دشتیاری۔ 2007۔ بلوچی زبان ءُ لبزانک۔ 2۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

نسائی ادب

دنیا کی ہر زبان کے ادب کے قدیم شکل یعنی لوک ادب "نسائی ادب" کے شہ پاروں کی ابتدائی تخلیق کار ہیں۔ بلوچی زبان میں صفت، لوری، نازینک، ہالو، لاڑو، زہیروک اور موتک جیسے گیت، نصیحت آموز کہانیاں اور قصے جیسے زندگی اور حقیقت سے بھرپور اصناف عورت کی بدولت ہمارے تک پہنچ کر ادب کا حصہ بن سکی ہیں۔ عورت کے لب ولہجے میں تخلیقی ادب کی روایت خاصی قدیم ہے۔ ہر زبان کے ادب میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ نوخیز بچے کی پہلی تربیت اور اخلاقیات کا گہوارہ آغوش مادری ہوتی ہے۔ انہی کے دم سے اُمیدوں کی فصل ہمیشہ شاداب رہتی ہے۔ عورت ہی دانہ دانہ جمع کر کے خرمن بنانے پر قادر ہیں۔ تاکہ آنے والی نسلیں زندگی کی ہزار ہا موسموں سے مستفید ہو سکیں۔ علامہ اقبال نے خواتین کے کردار کے متعلق لکھا ہے۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

تاریخ کے اوراق یہ واضح کرتے ہیں بلوچ عورت نے زندگی کے ہر میدان میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ کہیں وہ بی بی بانڑی کی شکل میں اپنے بھائی میر چاکر رند کو دہلی میں سوریوں کے خلاف جنگ آزما پا کر میدان جنگ میں کود پڑتی ہے اور پسپائی کو فتح میں تبدیل کر دیتی ہے۔ کہیں بی بی بیبو کی شکل میں اپنے بھائی کی مسلسل شکست دیکھ کر میر احمد خان، خان قلات کا جرار لشکر لے کر دشمن پر حملہ کر دیتی ہے اور میدان جنگ میں شہادت کا رتبہ پا لیتی ہے۔ کہیں وہ اپنے باپ میر احمد خان کے ساتھ جنگی حکمت عملی بنا کر بی بی بانو کی صورت میدان میں اتر کر فتح پا کر شیر زال (بہادر خاتون) کا لقب پاتی ہے۔ کہیں بی بی گنجاتی کی شکل میں اپنے شوہر میر محراب خان شہید کے ساتھ انگریزوں کے خلاف جنگ میں آخری مرحلے تک ساتھ دیتی ہے۔ کہیں بی بی چھاگلی کے نام سے

سازشوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے بعد لسبیلہ کی حاکم بنتی ہے۔ کہیں ایران کی سرحد پر جنرل ڈائر کے ساتھ کامیاب مذاکرات کرتے ہوئے گل بانو کی شکل میں اپنے شوہر، سردار و دیگر قبائلی افراد کو فرنگیوں کی قید سے آزاد کراتی ہے۔ کہیں نصیر خان اعظم کی والدہ مریم بی بی کی شکل میں متعدد جنگی معرکوں میں دیگر قبائلی خواتین کے ہمرکاب زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی نظر آتی ہے۔ کہیں میر محراب خان کی بیٹی اللہ ڈنی کی شکل میں قبائلی محافل و فیصلوں کی سربراہی کرتی نظر آتی ہے۔ تو کہیں فرغانہ کی ریحانہ بنت الحسن کے نام شائق علوم بن کر ابوالریحان محمد ابن احمد البیرونی سے داد تحسین وصول کرتی ہے۔ کہیں مہناز بن کر اپنی حرمت کی پاسداری کرتی ہے۔ کہیں حانی کی شکل میں محبت میں یکتا بن جاتی ہے۔ کہیں سمیک کی شکل میں وفا کا پیکر دکھائی دیتی ہے۔

بلوچی زبان میں ادب کے شعبے میں نسائی کردار ظاہراً تو محدود نظر آتا ہے۔ مگر بلوچی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو ادب کے تحفظ، ترقی اور ترویج میں ان کا کردار کلیدی رہا ہے۔ بلکہ وہ تو بلوچی لوک ادب کی اکثر اصناف کی سرخیل ہیں۔ وہ لوک ادب کی اکثر اصناف کی تخلیق کار کا کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ جدید ادب میں افسانہ نگاری، ناول نویسی، شاعری، ڈرامہ، تراجم، انشائیہ، تحقیق وغیرہ میں ان کی خدمات قابل ستائش ہیں۔ موجودہ دور میں سیاسی، انتظامی، قبائلی، سماجی اور معاشی رکاوٹوں کے باوجود دیگر شعبہ جات کی طرح ادب کے فروغ میں اپنا حصہ ڈال رہی ہیں۔ لیکن جس طرح سماجی، سیاسی، قبائلی اور معاشی شعبہ جات میں ان کی خدمات کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ اسی طرح ادب کے میدان میں بھی ان کے کردار کو اجاگر نہیں کیا گیا۔ یہ صرف ہمارا المیہ نہیں بلکہ اس خطے میں ماحول ہی ایسا پیدا کیا گیا ہے جس میں عورت کے کردار کو ہر دور میں یکسر شرف قبولیت دینے کا رواج پنپ نہ سکا۔

حقیقت یہ ہے دیہی عورت ہو یا شہری، پڑھی لکھی ہوں یا ان پڑھ۔ وہ گرہستی سے لے کر کھیت و کھلیان، گلہ بانی اور دفاتر سمیت زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے ہم قدم اور کہیں دو قدم آگے دکھائی دیتی ہیں۔ بلوچ معاشرے میں عورت کی عزت کا پہلو دیگر ہمسایہ اقوام سے بہتر نظر آتا ہے لیکن یہاں پر بھی ان کے معاشی، سماجی، ثقافتی اور ادبی کردار کو اجاگر نہیں کیا گیا۔ بلکہ ہر میدان میں بھرپور طریقے سے حوصلہ شکنی کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ لیکن وہ بھی جہد مسلسل کی علامت بن کر رکاوٹوں کو توڑ کر آگے بڑھتی چلی آرہی ہے۔ وہ کاغذ و قلم سے رشتہ جوڑ کر سلیقے

کے ساتھ اپنا تاریخی کردار ادا کرنے مصروف عمل دکھائی دے رہی ہے۔

بلوچ عورت نے بلوچی زبان کے ساتھ ساتھ براہوی، سندھی، سرائیکی، فارسی، عربی، روسی و دیگر زبانوں کے ادب کے فروغ میں دستیاب مواقع کے پیش نظر کردار ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ لیکن ہمارا موضوع بحث صرف بلوچی ادب ہے۔ بیسویں صدی کی پانچویں اور چھٹی دہائی سے جب بلوچی رسائل و جرائد کا آغاز ہوتا ہے پھر یہ سلسلہ ماہنامہ اومان کراچی، بلوچی کراچی، بلوچی کوئٹہ، سوغات کراچی، بانگ کوئٹہ، زمانہ بلوچی کوئٹہ، اولس کوئٹہ، بلوچی لبزانک کوئٹہ، بلوچی زند نوشکی، توکیں دور کوئٹہ، کچکول بلیدہ، گیوار تربت، چنگ تربت، لبزانک کراچی، روچ تربت، بہار گاہ کراچی، پچکان کراچی، کاروان تربت، آدینک تربت، درد گوادر، جہد گوادر، مستاگ بلیدہ، مستاگ کراچی، منزل کوئٹہ، سنگت کوئٹہ، دزگہار تربت، وغیرہ کے ساتھ ساتھ بولان میڈیکل کالج کے مجلے، "سب بولان" گورنمنٹ گرلز کالج کوئٹہ کے زرخون، انجینئرنگ یونیورسٹی خضدار کے شاشان، دروشت تربت، آسیاپ تربت، آساپ کوئٹہ و دیگر رسائل و جرائد نے دور جدید میں خواتین کو ادب کے شعبے میں مواقع فراہم کیے۔ آزات جمالدینی نے جب بلوچی کراچی کا آغاز کیا تو اس میں خواتین اور بچوں کے لئے باقاعدہ طور پر الگ گوشہ بنایا۔ ان کی وفات کے بعد جب عبدالواحد بندیگ نے بلوچی کوئٹہ کا آغاز کیا یوں پہلے بانک گوہر ملک اور بعد میں صبیحہ کریم رسالے میں خواتین گوشے کی نگران رہیں۔ مرحومہ شاہینہ شاہین نے اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے ابتدائی سالوں میں "دزگہار" میگزین کے نام خواتین کا پہلا بلوچی رسالہ نکالا، طویل وقفے کے بعد اس کا دوسرا شمارہ شائع ہوا اور پھر وہ مردانہ سماج کے ظالمانہ رویوں کے شکنجے کا شکار ہو کر قتل ہو گئیں۔ اس کے علاوہ دیگر رسائل و جرائد نے بھی کبھی کبھار یہ اقدام اٹھایا لیکن اول الذکر کے ساتھ ساتھ ہر ایک نے اپنی جگہ پر یہ سلسلہ تواتر کے ساتھ آگے نہیں بڑھایا۔ اس کے علاوہ "بانک" نامی سوشل ویب سائیٹ بھی خاتون نگران کی وجہ سے بلوچ خواتین کو ادب کے شعبے میں خوب دلجوئی کر رہی ہیں۔

بلوچی ادب میں ابتدائی طور پر بانک ط۔ روحی، رشیدہ مینگل، تاج ملک مینگل، گوہر ملک کا نام چھٹی کی دہائی میں نظر آتا ہے۔ اس کے بعد اس کاروان میں عبیدہ قیوم، بشریٰ قیوم، م۔ سلطانہ، ذکیہ سردار خان، بانک دشتیاری، مین مین دشتی، صبیحہ کریم، زاہدہ رئیسی، صبیحہ مینگل، زینل

کولاچی، صدف مہر، نسیمہ بلوچ، آمنہ فوزیہ بلوچ، روبینہ ناز بلوچ، مہ جبین بلوچ، فوزیہ بلوچ، کی پرواز، مہلب نصیر، ممتاز بلوچ، عندلیب گچکی، مہ رنگ بلوچ، طاہرہ احساس جتک، سعیدہ حسن، ستارہ جبیں محمد حسنی، مہلب بلوچ، کریمہ بلوچ، زینت ثنا، نسرین بلوچ، رخسانہ دُر محمد، مہلب زرجان، رخشندہ تاج، پروین بلوچ، فریدہ بلوچ، طاہر بلوچ، آمنہ پناہ، شگفتہ رحمان، بی بی تاج بانو، مدیحہ رسول، بانل مہرواڑی، شاہینہ شاہین، ماہ نور، شاری بلوچ، ماہبر بلوچ، بانڑی بلوچ، ثنا بلوچ، صدف سہیل، عابدہ صنم، حبیبہ پیر جان، عائشہ منیر، گل یاسمین، ماہ نور رنگی، پری آسکانی، سارہ بلوچ، شریف رشید، فائزہ ستار، سال بلوچ، فرزانہ بلوچ، شنید محمد حسن، رضیہ عزیز اللہ، گلناز شبیر بلوچ وغیرہ نے بلوچی ادب میں شاعری، افسانہ نگاری، ناول نگاری، انشائیہ و دیگر اصناف میں اپنا کردار ادا کر کے بلوچی ادب کے فروغ میں اپنا کردار ادا کیا ہے اور کر رہی ہیں۔ اس کے علاوہ لاتعداد خواتین ہیں جن کے نام رسائل و جرائد وغیرہ کی زینت نہ بن سکے یا ان کی رسائی نہ ہو سکی ہے۔ مکتب درخانی کی جانب سے بی بی تاج بانو کی کتب "پنت لقمان"، "پیر، تکمیل بجواب"، "عالم برزخ"، "پنج گنج"، "خطبہ بلوچی"، "وفات نامہ آنحضرت" اور "اقصہ قصہ" قابل ذکر ہیں۔

بلوچی ادب جہد کار بحرین کی جانب سے اے آر داد کا ترتیب دی گئی خواتین کی شاعری اور دیگر اصناف کا مجموعہ "پتاں تاکیں انجیر" (چوڑے پتے والی انجیر) خواتین کے ادب کو قارئین تک خوبصورت انداز میں روشناس کرنے کی اچھی کاوش ہے۔ جس میں زینت ثنا، صبیحہ مینگل، زاہدہ رئیس راجی، عندلیب محمد خان، گنجاتون بلوچ، صبیحہ کریم، فریدہ بلوچ، گوہر ملک، کی پرواز، ع۔ر۔ع دشتی، وزیرہ بلوچ، گل نسا بلوچ، یاسمین رؤف، شہناز عبیداللہ، روبینہ زیاد، سعیدہ حسن، مریم سلمان ہاشم، زمرد عبدالمجید، فیروزہ، ثریا بلوچ، کریمہ بلوچ، ماہ گل بلوچ، بانی بلوچ، م۔ مینگل، عارفہ بی بی بلوچ، مصرم الٰہی ناز، رضوانہ شاہد، گل ثمن بلوچ، سلمیٰ آزات، نازل جمعہ، رحیمہ ناز، زرگل، فرزانہ بلوچ، نسیمہ بلوچ، سلطانہ بلوچ، امیمہ فاطر بلوچ، کریمہ بلوچ، صائمہ بلوچ، پروین بلوچ، ایسیات بی بی بلوچ، نائیلہ بلوچ، نرگس بلوچ، سی گل امام، ماہ روش بلوچ' عمرانہ قادر' شاذیہ فاروق' عابدہ عبدالواحد' فریدہ انجم' بانل دشتیاری' آمنہ ستار، عندلیب گچکی، سہیلہ فائز، مہلب نصیر، رخشندہ تاج، عصمت سلطان، طاہرہ احساس جتک، زمرد بلوچ، فرح زاہد حسین، راشدہ بلوچ، وحیدہ عصا، قمر النسا بلوچ، رخسانہ ملوک، ماہناز بلوچ، مہلب زہیر، دروشم

بلوچ، مہہ جبین بلوچ، یاسمین، گرناز بلوچ، پاکیزہ صالح، بشرہ گل، زینل کولاچی، گل بی بی، حافظہ شریفہ مزار، عقیلہ سحر، زینت زہری، روزل خالد کی شاعری اور تحاریر شامل ہیں۔

بلوچی اکیڈمی کی جانب سے 1960 میں ڈاکٹر سردار خان کی کتاب "سرمست بلوچستان" 1980 میں عبیدہ قیوم کی کتاب "ماس ماس" بشریٰ قیوم کی کتاب "زاہول کارہ کرد" م سلطانہ کی کتاب "موریگ موکو نوہنگ کنک" شاہین روحی بخاری کی کتاب "شیر بلوچستان، 2007 میں ڈاکٹر زینت ثنا کی کتاب "بلوچی ادب میں تنقیدی جائزہ" شائع ہوئیں اور گل رنگ اور یاسمین لعل محمد کی کتاب "جنگل ءِ سہ" 1995 میں آزات جمالدینی اکیڈمی کراچی کی جانب شائع ہوئی۔ اسی طرح عندلیب گچکی کی ڈراموں کی کتاب "ہو تئی بار ءِ دیما" بلوچ رائٹرز کونسل کراچی کی جانب سے شائع ہوئی ہے۔ طاہرہ احساس جتک کی کتاب شانتل 2014 میں نیو کالج پبلیکیشنز کوئٹہ نے شائع کی جبکہ سعیدہ مینگل کی کتاب "میر خداداد خان کے دور کا جائزہ 2014" میں بلوچی اکیڈمی سے شائع ہوئی، بلوچستان اکیڈمی تربت نے 2012 میں رخشندہ تاج کے افسانوں کی کتاب "کندیل ءِ ہوبانت" بلوچستان اکیڈمی تربت کی جانب سے شائع کی، سچکان پبلی کیشنز نے سال 2014 میں عندلیب گچکی کے افسانوں کی دو کتابیں "آزاتی ءِ روگیں چراگ" اور "رژن ءِ اوبان" شائع کیں۔ اسی طرح۔ گوہر ملک کے بلوچی افسانوں کو جمع کر کے اردو ترجمہ پر ڈاکٹر شاہ محمد مری کر کے "بلوچ نے مجھے دکھایا" کے نام سے کتاب شائع کی۔ احساس پبلی کیشنز کیچ کی جانب سے بانک قیروزہ کی کتاب "ہمسفر ءِ جوہت" 2016 میں شائع ہوئی۔ بلوچی اکیڈمی کی جانب سے غنیمہ خالق کی تحقیقی کتاب "نود شزاں" 2017 میں شائع ہوئی۔ زاہدہ رئیسی راجی کی افسانوں کی کتاب "بے تنہ ءِ من ہوا ءِ حیثیت" 2016، ناولٹ "پاد ءِ چیر ءِ زمین" 2018 اور تحقیقی کتاب "سنگیں مرد وارد" 2020 میں رئیسی کتاب ونشنگ، کراچی کی جانب سے شائع ہوئی ہیں، گی پرواز کی افسانوں کی کتاب "چادر ءِ ہاوو گردیں کول" بلوچی اکیڈمی کی جانب سے شائع ہوئی۔ اسی طرح یو ایس ایڈ ریڈنگ پروجیکٹ کے تحت 2018 میں رخشندہ تاج کے کتابچے "ورسانی وشی" اور "ہورانی موسم" صبیحہ علی بلوچ کے کتابچے "ہر کس پہ کار ءِ وت"، "وشتاتی رکینگ" اور "ماسی مگل ءَ آتی و بچ" نسرین قاسم کے کتابچے "وش رنگیں رزان"، "پچاس مہ ستر ت"، "مارا وانگ دوست بیت"، "دوست ءِ بوتن روچ" اور "من فاطمہ جناح"

شائع ہوئیں۔ بلوچی اکیڈمی کی جانب سے طاہرہ احساس جتک کی افسانوں کی کتاب "ہزار رنگیں دنیا" اور صبیحہ علی بلوچ کی تحقیقی کتاب "بلوچ جنین آ دمانی لبزانکی دپا گردی کرر" 2019 میں اور ثانیہ احمد کی تحقیقی کتاب "بلوچی قصہ" 2020 میں اور یاسمین حلیم کی کتاب "بلوچی ناول ءُ رجانک" 2021 میں شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ 2022 میں مجاہد بلوچ کی کتاب "زندءُ گور گند" مست گی فاؤنڈیشن کراچی کی جانب سے شائع ہوئی جو گوہر ملک کی فن و شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کی تحاریر، افسانوں، تراجم اور شاعری پر مبنی کاوش ہے۔

حوالہ جات:

1۔ صبا دشتیاری۔ 2009۔ بلوچی زبان و لبزانک 3 ۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ کراچی۔ ص۔ 22-21

2۔ مجاہد بلوچ۔ 2021۔ کتاب گچ۔ شعبہ بلوچی، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ

3۔ عرفان جان دشتی۔ 2021۔ کتاب شون۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

4۔ صبا دشتیاری۔ 2003۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 1۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

5۔ صبا دشتیاری۔ 2007۔ بلوچی زبان و لبزانک۔ 2۔ سید ہاشمی ریفرنس کتابجاہ، کراچی

6۔ بانک ویب سائیٹ

بچوں کا ادب

ادب کے ذریعے بچوں میں حیرت مسرت کے جذبات پیدا کرنا، بچوں کی آنکھوں میں چمک اور ان کے چہروں پر ضربات کی لہروں سے سرخی کے ڈورے ڈالنا ادیب یا آرٹسٹ کا کمال ہے۔ بچوں کا ادب تخلیق کرنے کے لئے ادیب یا شاعر کو بچوں کی نفسیات کا ادراک ضروری ہے۔ بچوں کی طلب اور علمی اور ادبی ضروریات کا احساس بھی ہو۔۔۔ کسی بھی ملک کی حقیقی دولت اور سرمایہ بچے ہی ہوتے ہیں۔ بچپن میں انھیں جس قسم کی تربیت و نشوونما ملتی ہے۔ اس پر ملک کے مستقبل کا انحصار ہوتا ہے۔ اتنا ہی ان کی ذہنی اور جذباتی اٹھان کی بھی اہمیت ہے۔ بچوں کی ذہنی ترقی اور مکمل اٹھان کے لئے نصابی تعلیم کے ساتھ جو چیز زیادہ اثر انگیز ہوتی ہے۔ وہ ان کی مادری زبان میں معیاری ادب کی فراہمی ہے۔ یہ ادب محض بچوں کی درس و تدریس کے لئے نہیں ہوتا بلکہ ان تفریح طبع اور ان کی فطری رجحانات کے نشوونما کے لئے ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں اس کو مکمل طور نظر انداز کیا گیا ہے۔

ہمارے ہاں ضرورت اس امر کی ہے کہ بچوں کے ایسے رسائل ہوں جو تاریخ، وقت، حالات اور مستقبل ضروریات کے مطابق ان کی ذہن سازی کر سکیں۔ تاکہ کمسن قاری حالات و واقعات سے واقفیت حاصل کر کے اور سماج میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے روشناس ہو سکیں۔ بچوں کے اخبارات و رسائل صرف مضامین، کہانیوں اور نظموں کا مجموعہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ ان اوراق پر بچوں کے مشاغل کے متعلق مفید مواد فراہم ہوں۔ پسندیدہ اشعار، لطائف، اقوال زریں، پند و نصائح کے علاوہ دینی معلومات، ایجادات، سائنس کی پیش رفت، کہانی، ڈرامے، کارٹون یوں سجا دیے جائیں کہ نونہال ان میں کھو کر کار آمد شہری بن جائیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ رسائل کے صفحات پر لکھنے کا ان میں شوق پیدا ہو اور ان

رسائل کو پڑھ کر ان میں لکھتے لکھتے اچھے قلمکار بن جائیں۔

بلوچی زبان میں بچوں کے ادب کے فروغ میں رسائل و جرائد نے بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ ابتدا میں ان رسائل و جرائد نے بچوں کا گوشہ بنایا۔ اب چونکہ اس میں کمی ہوئی ہے تاہم بچوں کا ادب کچھوے کی چال میں آگے کی جانب رواں دواں ہے۔ چند رسالوں نے بچوں کے لئے گوشہ مخصوص کیا لیکن اس میں تسلسل نہیں نظر آتا۔ ان گوشوں میں طنز و مزاح، محاورے، کہانیاں، اقوال زریں وغیرہ شائع ہوتے رہے ہیں۔ بلوچی زبان بچوں کی کہانیوں پر مشتمل فقیر محمد عنبر کی پہلی کتاب "ایب ءُ گوازی ءِ پربند" (کھیل و کود کے نظمیں)، 1974 بلوچی پبلی کیشنز، کوئٹہ، اسی طرح امیر عبدالقادر کی کتاب "پاکستان لیب" (پاکستان کے کھیل)، 1980 میں، نصیر شاہین اور غوث بخش صابر کی کتب مشکولی" (کھیل)"، "چکی پربند" (بچوں کی نظمیں) اور "لیب" (کھیل) 1982، میں بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ کی جانب سے شائع ہوئیں۔ اسی طرح گل رنگ، یاسمین اور لعل محمد کی کتاب "چکانی سر" 1993، "صبح لنگ ءِ فالگ" 1996 اور "ہر گوش ءُ کپیک" 1999 میں آزات جمالدینی اکیڈمی، کراچی، عبدالواحد شاکر کی کتاب "چکاں چکاں گوازی" (بچوں کے کھیل)، 1998 میں عزت اکیڈمی، پنجگور اور حکیم وفا کی کتب "زندگانی چاگرد" (بچوں کا معاشرہ / ماحول) اور "پگل ءِ دنیا" (مینڈک کی دنیا)، 2000 میں، بچوں کی کتب ہیں اسی طرح بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی جانب سے لوک کہانیوں کا تسلسل ہے۔ وہ بھی بچوں میں بہت مقبول کہانیاں رہی ہیں۔ بچے جو چھوٹی عمر میں اپنی دادیوں اور نانیوں سے کہانیاں سن کر جوان ہوتے ہیں۔ جن میں گیدی قصہ اول سے لے کر گیدی قصہ نہمی تک 9 کتابیں ہیں۔

اس کے علاوہ شے رگام کی کتاب "بادشاہ عداوند اوت" (بادشاہ خداوند خود تھے) شامل ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر یٰسین صبا کی کتاب "پنت سر" (نصیحت بھری کہانیاں) بلوچی ادبی جہد کار بحرین اور "مہرگ" بلوچستان اکیڈمی تربت اور بالاچ حمید کی کتاب "زندگانی لبزانک" 2019 میں بلوچی اکیڈمی کی جانب سے شائع ہوئیں۔

حوالہ جات:

1۔ مجاہد بلوچ۔ 2021۔ کتاب گنج۔ شعبہ بلوچی، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ

2۔ عرفان جمالدینی۔ 2021۔ کتاب شون۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

پیشِ خدمت ہے "کتب خانہ" گروپ کی طرف سے ایک اور کتاب

پیشِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔ گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

کتب خانہ

Public group · 34K members

+ Invite

You Topics Photos Files
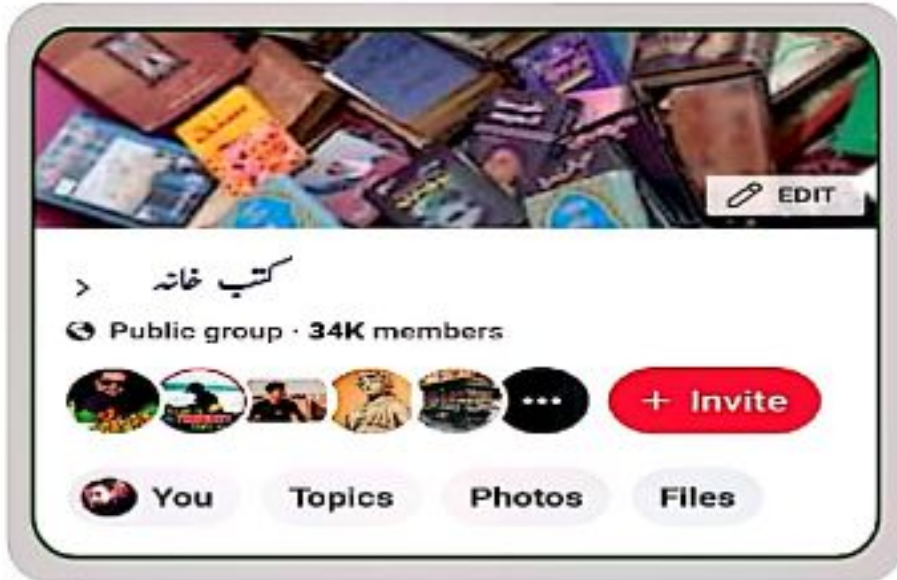
عقابی : +923055198538

محمد اطہر اقبال : +923340004895

محمد قاسم : +971543824582

میاں شاہد عمران : +923478784098

میر ظہیر عباس روستمانی : +923072128068

طالبانِ دعا :

ایڈمنز "کتب خانہ"